مجاز، کچھ یادیں

مرتبہ
احمد ابراہیم علوی
منظر سلیم

مجاز کچھ یادیں

ایک روپیہ —— RS: 1/-

پبلشر —— ضیا عظیم آبادی
پرنٹر —— شاہی پریس لکھنؤ

مجاز کچھ یادیں

مجاز کے فن و زندگی پر مقالات

احمد ابراہیم علوی
منظر سلیم

س

الما بک ڈپو نمبر ۵ زبیدہ ولا حسین گنج لکھنؤ ۶

فہرست مضامین

مجاز کے والدِ محترم

جناب سراج الحق صاحب

کے نام

"اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے"

مگر بعض مواقع ایسے آجاتے ہیں جب اپنا بیان حسن طبیعت نہ ہونے کے باوجود بھی کچھ نہ کچھ کہنا پڑتا ہے ورنہ یاران طریقت سوچتے ہیں ع

"آج غالب غزل سرا نہ ہوا"

مجاز مرحوم ہمارے ہم نوالہ ہم پیالہ نہ سہی لیکن قریب تر دوستوں میں ضرور تھے۔ میں نے بارہا انھیں پٹنہ بلوایا۔ خوب خوب محفلیں گرم ہوئیں اور شروع ہر نغمہ کے ساغر چلے۔ وہ بڑے پیارے انسان تھے۔ اور ان کا یہ پیار ہی تھا جس نے آنکھوں کے آنسو خشک ہونے سے پہلے ہی سے مجھ سے لکھوالی۔ پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ ع حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

یہ وقت تھا کسی قدر حق ادا کرنے کا حساس و مردم شناس نوجوان یوم مجاز منا رہے ہیں تجارت کو پس پشت ڈال کر علم و ادب کی خدمت کرنے والے ممتاز ناول نگار جناب حسرت ملیح آبادی منظر سلیم و ابراہیم علوی کی مرتبہ کتاب پیش کرنے میں ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہیں بہ حیثیت ناشر کے میں بھی خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہو سکتا تھا۔ لیکن مضامین اتنی دیر سے موصول ہوئے کہ ہم باوجود سعی بلیغ کے یوم مجاز کے موقع پہ یہ یادگار مجموعہ نذر قارئین نہ کر سکے۔ پھر بھی کچھ زیادہ تاخیر نہ ہوئی اور ہمارے تمام ساتھیوں نے ہمارا ہاتھ بٹا کر بہت جلد ہمیں سرخرو کر دیا۔ اور سب نے مل کر شاعر شہر نگاران کو اپنے خلوص و عقیدت کا ثبوت دیا

دل کا اک ٹکڑا ہے قدموں کی طرف

گر قبول افتد زہے عز و شرف

آپ کا اپنا

ضیا عظیم آبادی ... الماس بکڈپو

باتیں جو مجھے کہنا ہیں

احمد ابراہیم علوی

(کنوینر لکھنؤ یوم مجاز کمیٹی، ایڈیٹر پندرہ روزہ "آگ" - لکھنؤ)

مضامین اور نظموں کا یہ مختصر سا مجموعہ میری محض چند ایام کی محنت کا ثمر ہے۔ مجھے اس سلسلے میں روایتی انداز میں کسی کو یہ دکھڑا نہیں سنانا ہے کہ میں نے ہزار سنگ تراشیاں کیں مگر مشہور ادبا اور شعرا کی تخلیقات نہ حاصل کر سکا۔ میں کبھی بھی کسی کی شہرت سے مرعوب نہیں ہوا۔ میں ہمیشہ فن دیکھنے کا قائل ہوں نام اور مقام نہیں اسی لئے اس کتاب کے سلسلے میں میں نے کسی بھی چلتے ہوئے مشہور شاعر یا ادیب سے مضمون یا نظم کے لئے گزارش نہیں کی۔ یہی وجہ ہے مجھے کہیں سے ناکامی نہیں ہوئی اور میں نے محض چار دن میں ایک ایسی کتاب شائع کر دی جو ہمیشہ اپنی ایک مخصوص اہمیت رکھے گی۔

اس مجموعے میں شامل مضامین کے بارے میں میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں جو میں بغیر کسی خوف جھجک یا خطرے کے کہوں گا۔ وہ یہ کہ اس کا ہر مضمون آج جو قیمت رکھتا ہے آج سے پچاس سال بعد بھی اس سے کم قدر قیمت نہیں رکھے گا کیونکہ اس مجموعے میں جتنے بھی مضامین ہیں ان میں ادیب کا خلوص، ہمدردی اور حقیقت

شامل ہے اور یہ حیرت انگیز امر ہے۔

یہ خلوص نہیں تو پھر کیا ہے کہ میں نے اپنا مضمون ایک گھنٹے میں منظر سلیم نے ڈیڑھ گھنٹے میں عثمان غنی آدھے گھنٹے میں احمد جمال پاشا نے صرف چند منٹوں میں لکھ دیا اور ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی نے بغیر روایتی اصرار اور تکلف کے دوسرے ہی دن اپنا مضمون دے دیا اسی طرح اوصاف احمد اور حسرت ملیح آبادی صاحبان نے بھی اپنے مضامین بہت جلد دے دیئے۔ بشیر علوی کا مضمون میں نے شائع شدہ شریک کیا ہے کیوں کہ بشیر علوی ایک زمانے میں مجاز کے خاص احباب میں سے تھے اور انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ کسی دوسرے سے ممکن نہیں وہ پاکستان میں ہیں جتنے دن میں خط بھیجتا اتنے دنوں میں تو کتاب شائع ہو رہی... اس لئے کوئی اور مضمون مانگنے کی نوبت ہی نہ آسکی۔

میں اپنے محترم بزرگ پنڈت آنند نرائن ملا کا از حد ممنون کرم ہوں کہ انھوں نے باوجود انتہائی مصروفیت کے اپنے پرانے کاغذات میں سے مجاز کا ایک ایسا ریڈیو پروگرام نکال کر بہت خلوص سے مجھ کو دے دیا جو آج ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ اس مجموعے میں ملا صاحب کچھ نہ لکھ سکے کیوں کہ وہ بید مصروف تھے اور میں جانتا ہوں کہ یہ مصروفیت روایتی مصروفیت نہیں تھی۔

ملا صاحب کے علاوہ ابھی لکھنؤ میں بہت سی قابل قدر ادبی شخصیتیں ہیں جو مجاز کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور لکھ سکتی تھیں جن میں حضرت ناظر کاکوروی، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، اختر علی تلہری، مولانا رضا انصاری، ستیش بترا وغیرہ قابل ذکر ہیں مجھے انتہائی افسوس ہے کہ وقت کی انتہائی

کمی کے سبب میں ان سے مل تک نہ سکا۔ مضامین مانگنا تو درکنار۔ میں اپنے
عزیز دوست حسرتؔ ملیح آبادی کا ہمیشہ ممنون کرم رہوں گا جنھوں نے ازراہ عنایت
اس مجموعے کو شائع کیا۔ مجھے بڑی خوشی اس بات کی ہے کہ مجھے حسرتؔ صاحب
سے اس مجموعے کو شائع کرنے کے لئے کسی قسم کی خوشامد نہیں کرنا پڑی اور اگر
ایسا کرنا پڑتا تو یہ مجموعہ منظر عام پر نہ آتا کیوں کہ میں فطرتاً خوشامد پسند نہیں ہوں یہ
میری مجبوری ہے جس کا مجھے افسوس نہیں خوشی ہے۔

اس مجموعے کے سلسلے میں میں نے حسرتؔ صاحب سے صرف اتنا پوچھا
یا یوں کہیئے کہ اجمالاً ذکر کیا کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ میں ۸ر دسمبر ۶۳ء کو یوم مجازؔ
کمیٹی کے زیر اہتمام جو یوم مجازؔ منایا جا رہا ہے اس سلسلے میں اس یوم کو ایک یادگار
حیثیت دینے کے لئے مجازؔ کے فن اور شخصیت پر ایک مجموعہ ترتیب دے دوں اور
آپ شائع کر دیں، بس فوراً وہ تیار ہو گئے میں نے چار دن میں مجموعہ ترتیب
دے دیا۔ انھوں نے چار دن میں شائع کر دیا۔

کلامِ شاعر بہ زبانِ شاعر

اسرار الحق مجازؔ

ذیل میں مجاز کا لکھا ہوا ایک مختصر ریڈیو فیچر ہے جو ریڈیو کے "کلام شاعر بہ زبان شاعر (کوی کے ساتھ) کے سلسلے میں مجاز نے ۲۳ر نومبر ۱۹۴۸ء میں آل انڈیا ریڈیو سے پڑھا تھا یہ جہاں اس لحاظ سے اہم ہو کہ اس میں مجاز نے اپنے بارے میں کچھ کہا ہے وہاں اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ مجاز کو اس زمانے میں پڑھنے کا موقع ملا جب کہ ان کے گروپ کے دوسرے لوگوں کے لیے ریڈیو کے دروازے بند تھے۔ اس مضمون پر ریڈیو ڈائرکٹر نے یہ لکھا تھا کہ یہ مجاز کی فن کارانہ صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ریڈیو پر پڑھا جا سکتا ہے۔ اور اس میں کوئی بھی بات قابل گرفت نہیں۔

احمد ابراہیم علوی

چھوٹا منھ بڑی بات ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ اس دور کے بیشتر شعرا کی طرح میری شاعرانہ زندگی کی ابتدا بھی غزل گوئی سے ہوئی ہے۔ ابتدا میں چند ہی غزلیں کہنے کے بعد فکر و بیان نے نظم کا میدان منتخب کر لیا۔ لیکن یہ سمجھ لینا

غلط ہوگا کہ نظم لکھنے کے دور میں میں نے غزلیں لکھنا ترک کر دیا۔ میں ان دونوں اصناف سخن کی لطافت کا قائل رہا ہوں کہ اور ان کی مخصوص اہمیت کا معترف بھی۔ البتہ ان دونوں کے اسلوب و تکنیک کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی مواد کے بارے میں بھی ایک مسلسل ارتقا کا قائل رہا ہوں۔ اور اسی روشنی میں کہہ سکتا ہوں خود میرے اپنے ہاں آج کی نظم کل کی نظم نہیں اور آج کی غزل کل کی غزل نہیں — اور شاید یہ غلط بھی نہیں۔

اس تمہید کے بعد اپنی ان چیزوں کے بارے میں اشارۃً کچھ کہنا ہے جو ہی آپ کی خدمت میں ابھی پیش کر رہا ہوں۔ سب سے پہلی نظم ایک بہت طویل خاموشی کے بعد ہوئی تھی۔ یہ نظم ~~اس وقت~~ لکھی جب ... سارے ... اور یہ

یہ مت سمجھے یا لو بس بجھ چکی تیری آگ

خود میری نظم کے متعلق — اس کی شان نزول اس کی نوعیت و اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالنا [illegible] مرے لئے مشکل ہے شاید اور بہتر اس کا موقع بھی نہیں ہے — اجمالاً یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس نظم میں میری بعض پچھلی نظموں کے مقابلہ میں زیادہ جذباتی اور فکری ٹھہراؤ ملیگا — اس نظم کے تانے بانے میں گزشتہ عشرتوں) سے بے نیازی ایک نئی جنت کا خواب — اس کی تعمیر کا حوصلہ — انفرادی و ذاتی انگیزش جذباتی تشنگی کا اور ایک ساتھ اجتماعی عشرت کے لئے

انفرادی جذبہ کس حد تک کارفرما ہے اسکی تحقیق بیکار ہے
نظم کس حد تک کامیاب ہے اسکا فیصلہ میرے
لئے مشکل ہے - بہرحال آپ فیصلہ
کریں -

اسرار الحق مجاز

فکر

نہیں ہرچند کسی گمشدہ جنت کی تلاش
اک نہ اک خلد طربناک کا ارماں ہے ضرور
بزم دوشینہ کی حسرت تو نہیں ہے مجھ کو
میری نظروں میں کوئی اور شبستاں ہے ضرور

مٹ کے برباد جہاں ہو گئے سبھی کچھ کھو کے
بات کیا ہے کہ زیاں کا کوئی احساس نہیں
کارفرما ہے کوئی تازہ جنون تعمیر
دلِ مضطر ابھی آماجگہ یاس نہیں

تازہ دم بھی ہوں مگر پھر یہ تقاضا کیوں ہے
ہاتھ رکھ دے مرے ماتھے پہ کوئی زہرہ جبیں
ایک آغوش حسیں شوق کی معراج ہے کیا
کیا یہی ہے اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

دھڑکنوں کا طرب انگیز تبسم کیا ہے!
ہے تو سب کچھ یہ مگر خواب اثر کیوں ہو جائے
حسن کی جلوہ گرِ ناز کا افسوں تسلیم
یہی قربانگہ اہل نظر کیوں ہو جائے

★

میں نے سوچا تھا کہ دشوار ہے منزل اپنی | اک حسیں بانہہ کے ریشمیں کا سہارا بھی تو ہے
دشتِ ظلمات سے آخر کو گذرنا ہے مجھے | کوئی رخشندہ و تابندہ ستارا بھی تو ہے

آگ کو کس نے گلستاں نہ بنانا چاہا | جل بجھے کتنے خلیل آگ گلستاں نہ بنی
ٹوٹ جانا درِ زنداں کا تو دشوار نہ تھا | خود زلیخا ہی رفیقِ مہِ کنعاں نہ بنی

یہی انعامِ وفا اُف یہ تقاضائے حیات | زندگی وقفِ غمِ خاک نشیناں کر دے
خونِ دل کی کوئی قیمت جو نہیں ہے تو نہ ہو | خونِ دل نذرِ چمن بندیٔ دوراں کر دے

غزل آپ نے سن لی اور اب آپ کی توجہ میری
غزل کی طرف مبذول کرانا لگا۔ غزل میں سادگی
ہے سادگی شاید کچھ پرکاری بھی آپ
تبدیلی کر لیں برداشت کے احترام کے ساتھ
ساتھ کچھ مضامین بھی آپ کو ملے تو ضرور اسے اس
غزل کی کامیابی سمجھوں گا — بہر حال ملاحظہ ہو

جنونِ شوق اب بھی کم نہیں ہے | مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے
بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا | تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
مری بربادیوں کا ہم نشینو | تمھیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے
اُدھر میری صداقت میں ہے شبہہ | اِدھر بھی بدگمانی کم رہی ہے
تقاضے کیوں کروں پیہم نہ ساقی | کسے یاں فکرِ بیش و کم نہیں ہے
ہزاروں غم ہیں اس دنیا میں لیکن | غمِ جاناں سے بڑھ کر غم نہیں ہے

بلا سے سیلِ غم و سیلِ حوادث — مرا سر ہو کہ اب بھی خم نہیں ہے
مجازؔ اک بادہ کش تو ہے یقیناً — جو ہم سمجھے تھے وہ عالم نہیں ہے

اس نظم اور اس غزل کے بعد ایک نظم 'مجبوریاں' پیش کروں گا۔ اس میں غزل اور نظم کچھ گھلی ملی سی نظر آتی ہیں۔ مجموعی طور پر اسے نظم ہی کہیں گے۔ ہر چند اس کا ڈھانچہ غزل ہی سا ہے اور اسپرٹ بھی کچھ غزل ہی کی ہے۔ اس نظم میں ایک انفرادی عشق و رومان کی مجبوریاں اور جذباتی کشمکش کی عکاسی ملے گی۔ اس نظم کے سلسلہ میں بعض نزاکتوں کی تشریح میرے لیے مشکل فعل ہوگا۔

ہر چند کہ یہ ایک بہت پرانی اور شائع شدہ نظم سے شائع شدہ نظم ہے۔ مگر چوں کہ یہ میری شاعرانہ شخصیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس لیے پیش کرتا ہوں۔ ملاحظہ۔

مجبوریاں

میں آہیں بھر نہیں سکتا کہ نغمے گا نہیں سکتا — سکوں لیکن مرے دل کو میسر آ نہیں سکتا
کوئی نغمے تو کیا اب مجھ سے میرا ساز بھی لے لے — جو گانا چاہتا ہوں آہ وہ میں گا نہیں سکتا ×
متاعِ سوز و سازِ زندگی پیمانہ و بربط — میں خود کو ان کھلونوں سے بھی اب بہلا نہیں سکتا
وہ بادل سر پہ چھائے ہیں کہ سر سے ہٹ نہیں سکتے — ملا ہے درد وہ دل کو کہ دل سے جا نہیں سکتا ×
سیہ کاری ہے جرم خودکشی میری شریعت میں — یہ حدِ آخری ہے میں یہاں تک جا نہیں سکتا

نہ طوفاں روک سکتے ہیں نہ آندھی روک سکتی ہے
مگر پھر بھی میں اس قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا

وہ مجھکو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اس کو پوجتا ہوں اور اسکو پا نہیں سکتا

یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری
کہ اس کے گیت بھی جی کھولکر میں گا نہیں سکتا

زباں پر بیخودی میں نام اس کا آ ہی جاتا ہے
اگر پوچھے کوئی وہ کون ہے بتلا نہیں سکتا

کہاں تک قصۂ آلامِ فرقت مختصر یہ ہے
یہاں وہ آ نہیں سکتی وہاں میں جا نہیں سکتا

حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہنچا نہیں سکتا

(نوٹ)

× یہ اشعار
ریڈیو پر
نہیں
پڑھے
گئے
تھے

مجاز

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

مجاز مرحوم، اردو شعر و ادب کی آبرو تھے، انھوں نے اپنے خون جگر سے چمنستان ادب کی آبیاری کی، اسے سرسبز شاداب کیا، اس کو تازگی، رعنائی حسن، زیبائی، رنگت اور خوشبو عطا کی۔ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی ترقی پسندی کی ادبی گندگی سے بچے رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے اردو شاعری اور ادب میں بہت سے قابل قدر شاعر اور ادیب پیدا کیے، جنھوں نے معجزہ فن کی ہے، خود جگر سے نمود، پر عمل کیا اور ادب کو اجتماعی شعور اور جمہوری ذہنیت کا آئینہ دار بنایا، جنھوں نے اپنی سحر بیانی سے ذوق حسن، ذوق فکر اور ذوق عمل کو آسودہ کیا۔ اور اپنے افکار و خیالات سے حال و استقبال کو ہم آہنگ بنا کر پیش کیا، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایسے فن کار بہت ہی کم ہیں۔ زیادہ تر ترقی پسند نام و تہذیب، آوارگی، اخلاقی گراوٹ، عریانی اور جنسی بے راہ روی کی ترجمانی کا مجاز مرحوم اپنے نادان دوستوں کے ہاتھوں مے دستی کا شکار ہو گئے، لیکن

ان کی ترقی پسندی میں دل گداختہ اور آبروئے شیوہ اہل نظر کا بڑا حصہ ہے
ان کی شاعری میں حسن، خیر اور حقیقت تینوں کا امتزاج بدرجہ اتم موجود ہے
دوسرے بیشتر ترقی پسند شاعروں، ادیبوں، افسانہ نویسوں کی طرح ان کے یہاں
حقیقت کے اظہار میں نہ تو عریانیت ہے پائی جاتی ہے نہ بوالہوسی کے جذبات
اور خیالات کو مشتعل کرنے والے الفاظ ملتے ہیں۔ انھوں نے ترقی پسندی حقیقت
نگاری کی آڑ لے کر خواہشات نفسانی یا جنسی بے راہ روی کا بیان مزے لے لے
کر نہیں کیا۔ ان کے کلام میں شاید ہی کوئی لفظ ایسا ملے جس میں نام نہاد ترقی پسندی
کے مسلک کی تائید ہوتی ہو یعنی گمراہی اور بے راہ روی پائی جاتی ہو۔ وہ علامہ
اقبال کے اس فارمولہ کی زد سے بڑی حد تک محفوظ تھے۔

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

انھوں نے خود آوارہ، ناشاد اور ناکارہ ہو کر اپنے کلام کو ان خرابیوں
سے بچائے رکھا انھیں یہ احساس ہر وقت تڑپاتا تھا اور ان کا دل کرب و اضطراب
میں مبتلا رہتا تھا ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کریں غم دل اور وحشت دل
کے ہاتھوں وہ عجیب کشمکش اور کشاکش میں رہتے تھے۔

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

ان کے غم نے وحشت کی شکل اختیار کر لی اور وحشت نے آوارگی کی لیکن
انھوں نے اپنے کلام کو وحشت و آوارگی سے محفوظ رکھا ان کے کلام میں غریبانہ

تعقل پسند انفیاتی خواہشات کے محرک اور بوالہوسی وہوس پرستی کے ترجمان الفاظ نہیں ملیں گے۔ ان کے کلام میں اعجاز فن کے ساتھ ساتھ سوز گداز اور سازو آہنگ بھی ہے۔ ان کی غزلوں اور نظموں میں سادگی حسن اصلیت اور غنائیت بلا کی ہے حسن وعشق کے رازہائے سربستہ کا انکشاف شیریں و دلکش انداز میں نہایت حسن وخوبی کے ساتھ کرنا مجاز کا خاص حصہ ہے۔ اور اسی لئے انھیں شاعر شہر نگاراں کہا گیا ہے اگرچہ ان کا کلام مجبوری و رعنائی کا ایک حسین پیکر ہے لیکن اس میں حریت، انقلاب اور اشتراکیت کے خیالات کی بھی بہتات ہے غزلوں میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے اور نظمیں تو پھر پوری کی پوری انھیں خیالات کی حامل ہیں یہاں ان کی شاعری میں حریت و انقلاب پر ایک نظر ڈالی جارہی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جسمانی اعتبار سے یہ دبلا پتلا اور نحیف الجثہ شاعر اپنے سینے کے اندر کتنا بہادر اور حریت نواز دل رکھتا ہے آزادی کے لئے اس کے دل میں کتنی تڑپ تھی۔ غلامی کی زنجیریں توڑنے، سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کر ڈالنے کے لئے وہ کتنا بے چین رہتا تھا وہ صرف جنس الفت کا طلبگار ہی نہیں تھا بلکہ شاعر بیدار بھی تھا وہ ایک لپکتا ہوا شعلہ اور چمکتی ہوئی تلوار تھا اور اسی لئے یہ شاعر آتش نفس فطری تقاضوں اور ماحول سے متاثر ہو کر اپنے محبوب مطرب کو مخاطب کر کے انقلاب ان الفاظ میں بلند کرتا ہے۔

پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شور انقلاب

مجاز نے یہ شور انقلاب ۱۹۳۳ء میں سنا تھا اور یہ پیشین گوئی بھی کی تھی۔

ختم ہو جائے گا سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام
توڑ کر بیڑی نکل آئیں گے زنداں سے اسیر
بھول جائیں گے عبادت خانقاہوں میں فقیر
حشر در آغوش ہو جائے گی دنیا کی فضا
دوڑتا ہوگا ہر اک جانب فرشتہ موت کا
اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق
آسماں پر خاک ہوگی فرق پر رنگ شفق

اور اس رنگ شفق میں با ہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

کوئی انکار کر سکتا ہے کہ مجاز نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ سنہ ۱۹۳۹ء میں حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔ دوسری جنگ عظیم ہو کر رہی اور اس کے بعد سرمایہ داری کا نظام دم توڑنے لگا۔ محکومی و غلامی کے اسیر ہتھکڑی اور بیڑی کی زنجیر توڑ کر باہر نکلنے لگے اور آفتاب حریت بصد آب و تاب طلوع ہو کے رہا اور آخر سنہ ۴۷ء میں جمہوریت کا آمریت مہذب نما بربریت یعنی انگریزوں کی حکومت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

اسی سال جب ترکی کی مشہور سیاست داں خاتون خالدہ ادیب خانم مسلم یونیورسٹی تشریف لے گئیں تو مجاز نے ان کے خیر مقدم میں ایک نظم یونیورسٹی یونین ہال میں پڑھی اس میں مجاز نے اپنی محکومی و غلامی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے خالدہ کو مخاطب کیا ہے۔

ہاں بتا دے ہم کو بھی اے روحِ اربابِ نیاز
کس طرح مٹتا ہے آخر رنگ و خوں کا امتیاز

دل پہ کیوں کر فاش ہو جاتے ہیں آزادی کے راز
چھیڑتے ہیں کس طرح محفل میں بیداری کا ساز
تیری آنکھوں میں سرورِ عشرتِ جمہور ہے
آہ یہ جوہر ہماری دسترس سے دور ہے

مجاز یہ جوہر آزادی عمر بھر تلاش کرتے رہے۔ ستمبر ۳۶ء میں جب مجاز دلی سے دل برداشتہ ہو کر لوٹے تو انھوں نے اپنی دل کی شکستگی پر آنسو نہیں بہائے۔ بلکہ دلی کو مخاطب کر کے اپنی انقلاب پسند فطرت کا اظہار نہایت بے باکی کے ساتھ کیا اور اسے بتا دیا کہ دنیا کی کوئی طاقت میرے ارادوں کو راستہ نہیں روک سکتی۔

فطرتِ دل دشمنِ نغمہ ہوئی جاتی ہے اب
زندگی اک برق اک شعلہ ہوئی جاتی ہے اب
سر سے پا تک ایک خونی راگ بن کر آؤں گا
لالہ زارِ رنگ و بو میں آگ بن کر آؤں گا

اسی طرح مجاز نے اپنی نظم مسافر میں اپنے عزائم کا اظہار کیا ہے کہ باوجود صد ہزاراں مصائب و مشکلات ان کے اٹھے ہوئے قدم نہیں رک سکتے بلکہ آگے بڑھتے ہی جا رہے ہیں گے۔

کوئی لاکھ روکے کوئی لاکھ ٹوکے
قدم اپنے آگے بڑھائے چلا جا۔

قدامت سے یہ کھینچتا ہی جا رہے گی
قدامت کی بنیاد ڈھائے جا
جو پرچم اٹھا ہی لیا سر کشی کا
اسے آسماں تک اڑائے چلا جا

یہ نظم ۳۷ء کی کہی ہوئی ہے اس وقت افق عالم پر جنگ کے بادل چھائے جا رہے تھے اور دیو استبداد اپنے خونخوار پنجوں میں امن عالم کو جکڑنے کے لئے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ دہر محشر بداماں ہو چکا تھا اور

زمیں جیں بر جبیں ہے آسماں تخریب پر مائل
رفیقانِ سفر میں کوئی بسمل ہے کوئی گھائل
تعاقب میں لٹیرے ہیں چٹانیں راہ میں حائل
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

یہ اندھیری رات کا مسافر مجاز اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی گیا نہ تو اجل کے قہقہے اس کے قدموں کو روک سکے نہ دیو استبداد کا شعلہ فشاں آہنی خنجر اس کے ارادوں کو بدل سکا۔ قلب گیتی کانپ رہا تھا۔ لیکن مجاز کا قلب ہمت و استقلال کا مجسمہ بنا ہوا تھا اس میں نہ تو گھبراہٹ تھی اور نہ کپکپاہٹ۔
اسی سال مجاز نے ایک نظم طفلی کے خواب کے عنوان سے لکھا یہ زمانہ مجاز کے عالم شباب کا تھا جوانی کے زمانہ میں بچپن کے خواب کو یاد کر کے مجاز نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ فطری طور پر انقلاب پسند تھے اور ان کی دلی تمنا یہ تھی۔

دریائے پر خطر کی موجوں کو چیر کر
کشتی سمیت دامنِ ساحل میں تھم بھی ہوں

اک لشکرِ عظیم ہو مصروفِ کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں

چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغِ آبدار
ہنگامِ جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں

قدموں پہ جن کے تاج ہیں اقلیمِ دہر کے
ان چند کشتگانِ دل میں ہم بھی ہوں

یہ تھے طفلی کے خواب میں مجاز کے ارادے جو انھوں نے جوانی میں بیان کیے لیکن جب یہی ارادے وہ نوجوان سے ظاہر کرتے ہیں تو ان میں اور زیادہ شدت پیدا ہو جاتی ہے۔

جلالِ آتش و برق و سحاب پیدا کر
اجل بھی کانپ اٹھے وہ شباب پیدا کر
ترے خرام میں ہے زلزلوں کا رازِ نہاں
ہر ایک گام پہ اک انقلاب پیدا کر
ترا شباب امانت ہے ساری دنیا کی
تو خارزارِ جہاں میں گلاب پیدا کر
سکون خواب ہے بے دست و پا ضعیفی کا
تو اضطراب ہے خود اضطراب پیدا کر
شراب کھینچی ہے سب نے غریب کے خوں سے
تو اب امیر کے خوں سے شراب پیدا کر
تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

مجاز کی مشہور نظم آوارہ میں بغاوت کا جذبہ اپنے انتہائی نقطۂ عروج پر پہونچ گیا ہے۔ شاعر کے صبر و ضبط کا پیمانہ چھلک گیا ہے وہ بے خود بے قابو ہو گیا ہے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے بار بار وہ یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھانے اور بہلانے کی کوشش کرتا ہے۔

"اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں"

لیکن اس کے دل پر غم کی وحشت کم نہیں ہوئی کوئی بھی اس کے درد کا درماں نہیں بنتا اسی عالم میں وہ حیران و پریشان آوارہ مارا مارا پھرنے لگتا ہے۔

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

سرمایہ دارانہ نظام نے حکومت کے پردہ میں لوٹ مار اور غارت گری نے تہذیب کے پردہ میں بہیمت اور درندگی نے دنیا والوں پر جو عذاب نازل کئے اور جن سے ان کی زندگی موت سے بدتر ہو گئی مجاز کا حساس دل ان کی تاب نہ لا سکا سارے جہاں کا غم اس کے جگر میں تھا۔ غم جاناں اور غم دوراں دونوں نے مل کر اس کی عجیب کیفیت کر دی تھی کس شدت کرب کے ساتھ وہ اظہار کر رہا ہے ؂

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سیکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

مجاز نے سرمایہ داری پر جو نظم لکھا ہے اس میں اس کے عیوب دل کھول کر بیان کئے ہیں اور اس کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے۔ سرمایہ داری کے خلاف مجاز کے سینے میں آگ سلگ رہی ہے۔ وہ اپنی آگ سے اس کو جلا کر خاک کر ڈالنا چاہتا ہے۔ اس کی عیاری و مکاری اس کا ظلم و ستم اس کی تہذیب اس کی بربریت سب نے انسانوں کا خون چوس لیا ان کو مفلس و نادار محکوم و غلام بنا دیا یہ وہ بلائے بے اماں ہے جس نے لاکھوں گھر پھونک ڈالے لیکن آج اس کی ہلاکت خیزی دم توڑ رہی ہے اور اس کے قصر استبداد کی بنیاد کمزور ہوتی جا رہی ہے مجاز نے یہ خوش خبری سب کو سنا دی۔

مبارک دوستو لبریز ہے اب اس کا پیمانہ
اٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیاد کاشانہ

اور جب اس انقلابی شاعر کے ہاتھوں میں آزادی کا پرچم آ جاتا ہے تو پھر اس کی خوشی کی کوئی حد نہیں رہتی وہ اس جھنڈے کی اہمیت کو جانتے ہوئے اس کی عزت جان کی بازی لگا کر کرنا چاہتا ہے اس جھنڈے کی حفاظت میں اس کو کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا یہ معلوم ہوتے ہوئے بھی وہ پست ہمت نہیں ہوتا بلکہ اس کا عزم اور جوان ہو جاتا ہے اس کا حوصلہ اور بڑھ جاتا ہے کیوں کہ اس کے ہاتھ میں جھنڈا ہے۔

مبارک دوستو لبریز ہے اب اس کا پیمانہ
اٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیاد کاشانہ

جانتے ہیں ایک لشکر آئے گا
توپ دکھلا کر ہمیں دھمکائے گا
پر یہ جھنڈا یوں ہی لہرائے گا
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

لاکھ لشکر آئیں کب ہلتے ہیں ہم
آندھیوں میں جنگ کی کھلتے ہیں ہم
موت سے ہنس کر گلے ملتے ہیں ہم
آج جھنڈا ہے ہمارے ہاتھ میں

اور جب کوئی فدائی وطن جلا وطنی سے واپس آتا ہے تو مجاز کے دل میں اس مرد کش و جانباز کے لئے محبت کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور جنس آزادی کا یہ خریدار اس مرد جوان سال و جوان بخت کو یوں مخاطب کرتا ہے۔

نطق تو اب بھی ہے پر شعلہ فشاں ہے کہ نہیں
سوز پنہاں سے تری روح تپاں ہے کہ نہیں
تجھ پہ بار غلامی کا گراں ہے کہ نہیں
جسم میں خون جوانی کا رواں ہے کہ نہیں
اور اگر ہے تو پھر آ تیرے پرستار ہیں ہم
جنس آزادی انساں کے خریدار ہیں ہم

مجاز اس مرد مجاہد کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ تیرے جذبہ حریت کی بدولت ایک عالم ترا شیدائی ہو گیا۔

ساقی و رند ہیں ترے ہیں مے گلفام تری
اٹھ کہ آسودہ ہے پھر حسرت ناکام تری
ہمہ ہمہ تیرے ہیں کل ملت اسلام تری
صبح کاشی تری سنگم کی حسیں شام تری
دیکھ شمشیر ہے یہ ساز ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھالے تو بڑا کام ہے یہ

اس بند میں مجاز نے شمشیر اٹھانے کی ضرورت پر زور دیا ہے ؎

دیکھ بدلا نظر آتا ہے گلستاں کا سماں
ساغر و ساز نہ لے جنگ کے نعرے ہیں یہاں
یہ دعائیں ہیں وہ مظلوم کی آہوں کا دھواں
مائل جنگ نظر آتا ہے ہر مرد جواں
سرفروشان بلاکش کا سہارا بن جا
اٹھ اور افلاک بغاوت کا ستارا بن جا

"مزدوروں کے گیت" میں یہ عزم بغاوت اور جذبہ انقلاب اور زیادہ ہو جاتا ہے
مزدور سرمایہ داری کا ستایا ہوا مہذب انسانوں کے پیروں تلے کچلا ہوا اب انقلاب و
انتقام کی انگڑائیاں لے کر اٹھا اور یہ رجز خوانی کرتا ہوا بڑھتا جاتا ہے۔

جس سمت بڑھا دیئے ہیں قدم
جھک جاتے ہیں شاہوں کے پرچم
ساونت ہیں ہم بلونت ہیں ہم
مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم

ہم کیا ہیں کبھی دکھلا دیں گے
ہم نظم کہن کو ڈھا دیں گے
ہم ارض و سما کو ہلا دیں گے

مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم

ہم جسم میں طاقت رکھتے ہیں
سینوں میں حرارت رکھتے ہیں
ہم عزم بغاوت رکھتے ہیں

مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم

جس روز بغاوت کر دیں گے
دنیا میں قیامت کر دیں گے
خوابوں کو حقیقت کر دیں گے

مزدور ہیں ہم مزدور ہیں ہم

مجازؔ ایک ایسے جہان نو کا آرزو مند ہے جس میں امیر و غریب کا امتیاز ختم ہو جائے اور اس جہان فانی کی تعمیر بغیر مسلسل جد و جہد کے ناممکن ہے وہ سب کو اس زنگ آلودہ نظام کو بدلنے کی دعوت دیتا ہے۔

مجازؔ کو قوانین کہن اور آئین فرسودہ سے شکوہ ہے وہ بطن گیتی سے سلیک آفتاب تازہ طلوع کرنا چاہتا ہے جس کی نورانی شعاعیں آزادی و حریت کی روشنی پھیلائیں۔ غلامی کی زنجیروں کو جلا کر خاک کر ڈالیں اس لئے وہ نئے آہنگ نو ناموس نگاران ہمان کی غیرت دلا کر کہتا ہے۔

اے جوانانِ وطن روح جواں ہے اٹھو
آنکھ اس محشر نو کی نگراں ہے تو اٹھو

خوف بے حرمتی و فکرِ زیاں ہے تو اٹھو
پاسِ ناموسِ نگارانِ جہاں ہے تو اٹھو
اٹھو نقارۂ افلاک بجا دو اٹھ کر
ایک سوئے ہوئے عالم کو جگا دو اٹھ کر
رنگِ گلہائے گلستانِ وطن تم سے ہے
شورشِ نعرۂ زندانِ وطن تم سے ہے
تم ہو غیرت کے امیں تم ہو شرافت کے امیں
اور یہ خطرے میں ہیں احساس بھی ہے کہ نہیں

مجاز کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے جب وہ سرحد پر اغیار کو شعلہ فشاں شرربار بڑھتا ہوا دیکھتا ہے۔ وہ نوجوانوں کو للکارتے ہوئے خطاب کرتا ہے۔

یہ تو ہیں فتنۂ بیدار دبا دو ان کو
یہ مٹا دیں گے تمدن کو مٹا دو ان کو
پھونک دو ان کو جھلس دو کہ جلا دو ان کو
شانِ شایانِ وطن ہو یہ بتا دو ان کو
یاد ہے تم کو کن اسلاف کی تم یادیں ہو
تم تو خالد کے پسر بھیم کی اولادیں ہو

یہ شاعر شہر نگاراں اور مطرب بزم دلبراں عمر بھر حریت و آزادی، انقلاب و بغاوت کے پرجوش مگر دلکش نغمے گاتا رہا وہ صحت مند انقلاب کا ہمیشہ متمنی رہا اسے اپنی فکر نہیں تھی خود چاک گریباں تھا لیکن دوسروں کی چاک گریبانی سے اس کا دل تڑپ اٹھتا تھا اس کی دلی آرزو تھی کہ دنیا میں سکون و راحت و فراغت ہو گو اسے کچھ بھی

نہ میسر ہو۔

اب یہ ارماں ہے کہ بدل جائے جہاں کا دستور
ایک ایک آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور
ایک اک جسم پہ ہو اطلس و کمخواب سمور
اب یہ بات اور ہے خود چاک گریباں ہوں میں

اگر وہ شاعر محفل وفا آج نہیں رہا لیکن اس کی شوخی بیان، جرأت رندانہ اور آزادی کلام اردو شاعری کو ہمیشہ تازگی اور زندگی بخشتی رہے گی اس میں عزم وہمت آزادی و حریت انقلاب بغاوت کے جذبات کو بیدار کرتی رہے گی۔ حریت پسند شاعروں کے دلوں کو اس کو یہ اشعار ہمیشہ گرماتے اور برماتے رہیں گے۔

آج بھی ساز ہے مرے گرمیٔ بزم سرگشتی
آج بھی ہے آتش سخن شعلہ فشاں سرزفشاں
آج بھی دل کو ہے مرے دولت آگہی نصیب
آج بھی ہے نظر مری ارض و سماں کی رازداں

اور یہ آج ماضی اور مستقبل کی حدوں سے پرے ہمیشہ رواں دواں اور جاوداں رہے گا۔

مجازؔ کی شاعری میں تعمیری پہلو

اوصاف احمد

فیضؔ نے مجازؔ کے مجموعہ کلام پر دیباچہ لکھتے ہوئے مجازؔ کو ایک لاابالی
اور سہل نگار انسان قرار دیا تھا اور اکیلے فیضؔ پر ہی کیا منحصر۔ مجازؔ کی موت
سے اس وقت اس کے نہ جانے کتنے دوستوں اور عزیزوں نے زندگی میں اس
کے لاابالی پن اور بے اصولے پن کا ماتم کیا ہے۔ لوگوں نے اسے عہد حاضر کے
بے اصول نوجوانوں کی ایک علامت قرار دیا ہے۔ لیکن جب ہم مجازؔ کے کلام میں
تجزیہ کرنے بیٹھتے ہیں تو اس میں ہمیں بے اصولی کے بجائے زندگی کے چند واضح اور
روشن اصول نظر آتے ہیں جن کی وہ سختی سے پابندی کرتا ہے۔ اس کی شاعری میں
ہمیں ایک مرتب انداز ملتا ہے جبکہ اس دور کے شاعروں میں ذہنی انتشار عام تھا۔
شعر کی تخلیق ایک پیچیدہ عمل ہے اور خادم کا لباس اختیار کرنے سے
پہلے اسے کئی منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کی تخلیق میں شعور اور وجدان دونوں
کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اگر شعر میں شعور کی کمی ہے تو وہ زندگی سے دور۔ خوابوں
کے جزیروں کی داستان ہوگی اور وجدان سے شاعر محروم ہے تو شعر میں وہ
غنائیت۔ وہ مستی۔ وہ کیف نہ آسکے گا۔ جو کہ شعر کی خصوصیت اور رکن عظیم سمجھے
جاتے ہیں۔ شعر کی تخلیق سے پہلے غیر شعوری طور پر شاعر کو ایک اور منزل سے گزرنا
پڑتا ہے جسے ہم "ذہنی تیاری" کا عمومی سا نام دے سکتے ہیں۔ یہ پیچیدہ عمل

کئی حرکات سے مرکب ہوتا ہے۔ پہلے شاعر کسی جذبے سے متاثر ہوتا ہے اور یہ تاثر ان تاروں کو چھیڑتا ہے جن کی جھنکاریں۔ غنائی لباس پہننے کے بعد ۔ درد سے درماں کا روپ اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر شاعر زود احساس واقع ہو تو اس کے اندر شاعرانہ خلوص ہوگا جو کہ شعر کی جان سمجھا جاتا تھا۔ اس بات کے ساتھ ساتھ ان بنیادی باتوں کا جن پر شاعر اپنے نغمے کی بنیاد رکھتا ہے۔ اس کے ذہن میں صاف تصور ہونا چاہیئے۔ اس کے ذہن میں خود روشنی ہونا چاہیئے تبھی وہ دوسرے ذہنوں کو جلا بخش سکے گا۔ اور فن کے حق سے عہدہ برآ ہو سکے گا۔ اسی تصویر کا دوسرا رخ یوں ہے کہ جب شاعر کے ذہن میں مسائل و موضوعات کا صاف تصور نہیں ہوتا۔ اس میں ' پر ستی ہوتی ہے تو فارم کے انتخاب میں بھی اسے خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔ نتیجہ کے طور پر وہ نئے فارم کی تلاش میں در بدر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ اردو شاعری میں اس ذہنی انتشار کی بہترین مثالیں۔ میراجی۔ ن۔م۔ راشد۔ اور فیض کی بعض نظموں میں ملتی ہیں۔

مجاز کی شاعری میں فارم کی ناکامی نہیں ہے۔ اس نے غزلوں اور نظموں کے پرانے فارم میں ہی اپنے خیالات کو بڑی فن کاری کے ساتھ سمویا ہے۔ اس کی شاعری میں اس قسم کی الجھنوں کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ قاری کو صرف تاریکی کا احساس نہیں دلاتا بلکہ اس کے ذہن کو روشنی بھی عطا کرتا ہے۔ ویسے الجھنوں کا احساس اسے بھی ہے۔ سب کی طرح مسائل اس کے سامنے بھی اپنا مہیب منھ پھاڑے کھڑے رہتے ہیں۔ بیسویں صدی کی مخصوص بے عملی اس کے یہاں بھی جھلکتی ہے۔ کیوں کہ یہ تمام چیزیں روح عصر ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی انفرادی خوبیاں ہیں۔ وہ ایک بیدار ذہن اور رچا ہوا شعور رکھتا ہے۔ وہ اس قسم کے مسائل کو۔ اس

بے علمی کو ۔ ان الجھنوں کو مخصوص قسم کے سماجی حالات کا نتیجہ سمجھتا ہے اور
انھیں دور کرنے کے لیے واضح حل رکھتا ہے۔

ایک شاعر کی پوری شاعری مختلف ادوار سے گذرتی ہے لیکن تذکرہ
نویسوں کی طرح ان ادوار کو سنہ اور تاریخوں سے ناپنا میں ایک شاندار
حماقت سمجھتا ہوں ۔ یہ ادوار مختلف ذاتی تجربات وخیالات داخلی کیفیات ،
خارجی اثرات اور سماجی و عمرانی حالات کے زیر اثر ہوتے ہیں ۔ اس طرح شاعر
کے خیالات و افکار میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے لیکن یہ تبدیلی کسی خاص تاریخ
یا ماہ ، سنہ وغیرہ کی پابند نہیں ہوتی ۔ یہ تبدیلی شاعر کے ذہن میں رفتہ رفتہ
غیر شعوری طور پر پرورش پاتی رہتی ہے ۔ اس کا شعور محرکات سے غیر شعوری
طور پر متاثر ہوتا رہتا ہے ۔ فن کار کی جگہ اس راہ میں پانی ہو جاتا ہے ۔
فن کار کو اپنی شخصیت فن میں ڈھالنی پڑتی ہے ۔ کئی بار مرنا پڑتا ہے اور جنم
لینا پڑتا ہے اور تب کہیں جا کر ایک خیال جاوداں ہوتا ہے ۔ ایک فکر نظر
جگہ پاتی ہے اور ایک تبدیلی ظہور میں آتی ہے ۔

مجاز کی شاعری اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہے ۔ اس کی شاعری بھی
مختلف ادوار سے مرکب ہے اور ان رنگارنگ ادوار سے اس کی شاعری میں
تنوع آیا ہے اس کی آواز میں توازن ۔ اور اس کی لے میں ایک کیف پیدا
ہوا ہے ۔ ان تمام چیزوں نے اس کی شاعری کو ایک نیا حسن عطا کیا ہے جو
اس کے قبول عام میں ممد و معاون ہے ۔

مجاز کی شاعری میں بھی مختلف ادوار ہیں ، اس پر بھی رومانوی اور
انقلابی دور گزرے ہیں ۔ اور آخر کار ان منزلوں سے گزر کر وہ تعمیر کی طرف

آیا ہے جہاں تخلیق کا وسیع میدان ہے۔ تعمیر کے نظریئے ہیں۔ حسن و کیف ہے۔ جہاں سے ذہن روشنی پاتا ہے اور منزل قریب نظر آتی ہے اس جگہ پہونچ کر ایک خاص قسم کی فتح مندی کا احساس ہوتا ہے۔ میں مجاز کی شاعری کے اسی رخ کو اجاگر کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ دور بھی رومانی اور انقلابی دور سے اسی طرح وابستہ ہے جیسے حال کے ایک لمحے کا تعلق ماضی اور مستقبل دونوں سے ہوتا ہے۔

مجاز کی عشقیہ شاعری میں محبوب کا تصور وہی ہے جو جدید شاعروں کا روایت پسند تصور ہے۔ وہ سحر کی یاد ہے اور خیال شام ہے زندگی کا سرمایہ ہے اور زندگی اسی کے دم سے عبادت ہے لیکن سب کچھ ہونے کے باوجود وہ اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ ان کی عشقیہ نظموں میں داخلی تاثر کی بھرمار ہے لیکن پھر بھی اس کے اندر جو دھیمی دھیمی جلن ہے وہ دل میں ایک لذت آمیز خلش کی تخلیق کرتی ہے اس کی خالص عشقیہ نظموں میں ایک طرح کی لذت پرستی ہے جو ذہنی بھی ہے اور جسمانی بھی۔ لیکن یہ لذتیت عام غنائی شعراء کی طرح کہیں بھی سطحی رنگ بے رنگ نہیں ہے مثلاً اختر شیرانی کے یہاں بھی لذتیت ہے، لیکن وہ لذتیت بڑی ایکانیت رکھتی ہے۔ وہ ایک ایسی وادی میں جو اس "عفت گنہ" بستی سے دور ہو کر کہیں کیف و سرور کی دنیا کے قریب ہو جانا چاہتے ہیں اگر ان کے پہلو میں سلمیٰ ہو اور سلمیٰ کی محبت بھی، تو انھیں کچھ نہیں چاہیئے۔ یہ بات طے شدہ ہے کہ حسن و عشق حیات انسانی کا ایک اہم پہلو ضرور ہے لیکن یہ مجسم و مکمل زندگی نہیں ہے۔ ہماری رومانی زندگی کا بھی باہر واقعیت کی دنیا سے تعلق ہے

ہم رد ماتوی ہو جانے کے باوجود اسی مادی دنیا میں قیام کرتے ہیں۔ ان میں چیزیں اپنی مادی حقیقت رکھتی ہیں۔ اور ہم ان حقائق سے کسی حال میں منھ نہیں موڑ سکتے۔ اس لئے نظموں میں ماورائیت نہیں خارجیت ہونی چاہیئے۔ زندگی ایک ناقابل تردید نامیاتی حقیقت ہے جو ہر دم تغیر پذیر ہے اس لئے ہم خالص تخیلی دنیا میں مقیم نہیں ہو سکتے جس کا ذکر اختر شیرانی نے "اے عشق کہیں لے چل" والی نظم میں کیا ہے جہاں کچھ گیسو ہمارے بازوؤں پر پریشان ہو جائیں اور ہم ان کاکلوں کے سائے میں اپنی زندگی گزار دیں۔ مجاز کی نظموں میں اکثر جگہ ارضیت پائی جاتی ہے ان کے یہاں محبوب کا تصور ایک ذہنی رفیق کی صورت میں بھی جلوہ گر ہوا ہے ؎

آؤ مل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

مجاز نے پہلے تو کچی عمر کی ہر طرف سے بے پروا۔ بے فکرانہ اور خواب نما محبت کے گیت گائے ہیں۔ جس میں ایک طرف تو یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ خود نقاب اٹھائیں اور دوسری طرف تقاضہ کا انتظار ہوتا ہے۔ جس میں تبسم کے راز از خود عیاں ہو جاتے ہیں اور کچھ کہنے سے پہلے ہی لوگ شرما جاتے ہیں۔ مجاز کو غنائیت کے اس مخصوص کیمیاوی عمل پر بھی قدرت حاصل ہے جبکہ گلرنگ چہرے عنابی ہو جاتے ہیں۔ اور مئے رنگین کے اثر سے ہر شئے گلابی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ خواب جلد ہی خونریز اور سنگین حقائق سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جاتا ہے۔ پہلے تو اس محبت میں بڑی رعونت ہے۔ وہ کسی کی پرواہ نہیں کرتی ہے۔ یہاں تک کہ محبوب کو بھی انقلاب لانے کی دعوت دے ڈالتی ہے

لیکن پھر شاعر کو حرم کے پاسبانوں کی کھینچی ہوئی حدوں کا احساس ہوتا ہے ؎

نہ آندھی روک سکتی ہے نہ طوفاں روک سکتے ہیں
مگر پھر بھی میں اس قصرِ حسیں تک جا نہیں سکتا
وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا
یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری
کہ اس کے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا

زباں پر بے خودی میں نام اس کا آ ہی جاتا ہے
اگر پوچھے کوئی یہ کون ہے بتلا نہیں سکتا
حدیں وہ کھینچ رکھی ہیں حرم کے پاسبانوں نے
کہ بن مجرم بنے پیغام بھی پہونچا نہیں سکتا

اور اس طرح رفتہ رفتہ مجازؔ کے یہاں ایک شعوری انقلاب آتا ہے پھر شاعری داخلی مضامین سے زیادہ خارجی مضامین کو تراشنے اور جوڑنے میں کیف و انبساط محسوس کرنے لگتا ہے۔ یوں کہئے کہ مجازؔ رومان کی راہ سے انقلاب کی طرف آئے۔ شروع کی شاعری میں انقلاب آتا ہے پھر شاعر داخلی مضامین خون اور آگ سے مزین تھا۔ اور اس طرح کا تصور انقلاب مجازؔ کے سبھی ہمعصروں کے یہاں ملتا ہے۔ مثلاً مجازؔ کی نظمیں سرمایہ داری' آہنگ جنوں' اور' انقلاب' پڑھئے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان نظموں میں مجازؔ نے بھی انقلاب کے لئے محض ڈھول پیٹا ہے۔

پھر مجازؔ کی وہ انفرادیت کیا ہے جس نے مجازؔ کے ان کے دوسرے ساتھیوں

سے ممتاز و ممیز کیا ہے ؟ وہ ان کی نظموں میں تعمیری شان ہے ۔ وہ محض انقلاب کا ڈھنڈورچی نہیں ہے ۔ شاعر کا کام ڈگی پیٹنا نہیں ہے اس کا کام تو سماجی شعور رکھتے ہوئے انقلابی اسباب کا تجزیہ کرنا ہے اور مجاز نے اس فرض کو بخوبی انجام دیا ہے ۔ آل احمد سرور نے مجاز کے بارے میں کہا تھا کہ وہ ایک رومانی شاعر ہے جو انقلابی رجحانات رکھتا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ صرف ایسا ہی نہیں ہے ۔ مجاز کی دو ہی نظمیں ' اندھیری رات کا مسافر' اور ' خواب سحر' ان کی قطعیت کی نفی کرنے کے لئے کافی ہیں ۔

' اندھیری رات کا مسافر' اس نظام کی تاریکی کو جو کہ ہندوستانی پر صدیوں سے مسلط ہے بڑے فن کارانہ انداز میں اجاگر کرتا ہے ۔ مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں' میں بڑا اعتماد ہے ۔ وہ یقین ہے جو کہ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا دیتا ہے ۔ اس میں اس فولادی عزم کی ایک جھلک ملتی ہے جو خون جگر سے معجزہ' فن کی نمود کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے ۔ اس نظم میں وہ آفاقیت ملتی ہے جو اقبال کی بیشتر نظموں میں جھلکتی ہے ۔ اس نظم کی آفاقیت سامراجانہ نظام کی تمام لعنتوں کا احاطہ کرتی ہے ۔ یہ حق و باطل ۔ خیر و شر ۔ نور و ظلمت روشنی و تاریکی کی ازلی کشمکش کو ظاہر کرتی ہے اور باطل کے مقابلے میں حق کا شر کے مقابلے میں خیر کا ظلمت کے مقابلے میں نور کا ساتھ دینے کے لئے بڑھاوا دیتی ہے ۔ چوں کہ اس میں منزل کی جانب رواں دواں رہنے کا احساس ہے اس لئے اس میں ایک مثبت رویہ بھی ہے ۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں ان مشکلات کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو اس راہ میں شب پر گزرتی ہیں ۔ لیکن ان سے دل میں خوف نہیں پیدا ہوتا بلکہ ہمت جاگزیں ہوتی ہے ۔ سے

بدی پر بارشِ لطف و کرم نیکی پر تعزیریں
جوانی کی حسیں خوابوں کی ہیبت ناک تصویریں
نکیلی تیز سنگینیں ہیں خوں آشام شمشیریں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

حکومت کے مظاہر جنگ کے پرہول نقشے ہیں
کدالوں کے مقابل توپ بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل تازیانے بیڑیاں پھانسی کے تختے ہیں
مگر میں منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

اسی طرح خوابِ سحر میں اس تعمیری انقلاب کے اسباب کا تجزیہ کیا گیا ہے جس کے نقوش، بقول فیض، غور و فکر کے بعد ہی سے ظاہر ہونے لگتے ہیں جب مجاز کہتا ہے ؎

آدمی منت کشِ اربابِ عرفاں ہی رہا
دردِ انسانی مگر محرومِ درماں ہی رہا

تو اس کی آواز میں جانے کہاں کا کرب سمٹ آتا ہے۔ یہ درد اور ٹیس صرف انسانیت کے زخموں کو کریدنے سے ملتی ہے۔ مذہب انسان کو زندگی کی تعلیم سکھانے آیا تھا لیکن بقول مولانا ابوالکلام آزاد "خود مذہب میں زندگی کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا" اس نے ہمیشہ غریبوں، دکھیاروں اور سینہ فگاروں کے زخموں کا مرہم بننے کی کوشش کی۔ لیکن غرض کے بندوں نے اس درمیان کی تجارت شروع کر دی۔ مجاز انسان کو ان اوہام کا غلام نہیں رکھنا چاہتا۔ اور دل میں تاریکی دماغوں میں اندھیرا دیکھ کر بڑے درد سے کہہ اٹھتا ہے ؎

اہل باطن علم سے سینوں کو گرماتے رہے
جہل کے تاریک سائے ہاتھ پھیلاتے رہے
یہ مسلسل آفتیں۔ یہ یورشیں۔ یہ قتل عام
آدمی کب تک رہے اوہام باطل کا غلام
ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

اس تعمیری انقلاب کا ایک پہلو مجاز کے یہاں عورت کے تصور کے روپ میں ابھرا ہے۔ ہمارے یہاں اردو شاعری کی تین سو سالہ تاریخ میں اب تک عورت کا صحیح تصور نہیں پیش کیا جا سکا۔ ویسے تو یہ بات دنیا کے ادب العالیہ کے لئے بھی کہی جا سکتی ہے۔ کہ کسی نے اسے کی طرح شیطان کی محبوبہ قرار دے دیا تو کسی نے کائنات کا محور۔

لیکن قدیم اردو شاعری میں خاص طور پر یا تو عورت محبوبہ ہے۔ یا پھر داشتہ اور طوائف۔ اس کے بعد سوا کہیں سے کوئی تصور نہیں ابھرتا ہے۔ غزلیات کے دور میں تو یہ بات مضحکہ خیز حد تک جا پہونچتا ہے۔ یعنی سینہ۔ چوٹی۔ انگیہ موباف سب کچھ موجود ہے اور آخر میں ردیف ہے "چلے آرہے ہیں" — اقبال بھی عورت کو آزادی دینے کے قائل نہیں۔ اکبر الہ آبادی کا ذکر ہی بیکار ہے۔ اختر شیرانی کے یہاں سلمیٰ۔ عذرا۔ ریحانہ کوئی عورت ہو سب کی سب محبوبہ ہے۔ جوش ترقی پسند ہوتے ہوئے بھی عورت کو تعلیم دینے کے خلاف ہیں ان کے یہاں عورت کا وہ درجہ ہے جو ایک مہکتے ہوئے پھول اور چھٹکی ہوئی چاندنی کا ہوتا ہے۔ حالی

پہلی بار ہمیں احساس دلایا تھا۔

"اے ماؤ بہنو بیٹیو دنیا کی عزت تم سے ہے"

مجاز کے یہاں اس کی ترقی یافتہ اور ترقی پسند شکل ملتی ہے۔ مجاز کسی طرف سے بھی تنگ نظر نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ معاشرے کی ترقی کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس میں عورت کا کیا مقام ہے۔ اس کے یہاں عورت صرف محبوبہ نہیں بلکہ ذہنی رفیق بھی ہے۔ وہ پردے کی رسم کا یوں تجزیہ کرتے ہیں۔

خیالات مبہم میں ہر وقت گم سم
دل نرم و نازک پہ ابر توہم
بجھا سا تبسم گھٹا سا تکلم
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

وہ اک کاوش تلخ ہر آن دل میں
وہ شام و سحر ایک خلجان دل میں
امنڈتا ہوا ایک طوفان دل میں
کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے

ہمارے مسلم معاشرے کی گھروں میں مقید لڑکیوں کا اس سے اچھا نفسیاتی تجزیہ کیا کسی شاعر نے کیا ہے؟ یا اس کی مثال اردو شاعری میں مل سکتی ہے؟ شاید نہیں۔ اس بات سے شاید ہی کوئی انکار کرے گا کہ جنسی بے راہ روی جتنی پردہ کرنے والی لڑکیوں میں ہوئی ہے اتنی بے پردہ لڑکیوں میں نہیں ہوئی۔ میں اس وقت اس بے راہ روی کے محرکات سے بحث نہیں کرنا چاہتا۔ بات مجاز کی شاعری کی ہو رہی ہے۔ مجاز نے پردہ کے بت کو صرف توڑا ہی نہیں ہے بلکہ ایک تعمیری حل بھی پیش کیا ہے۔

ترے نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا
یہ تیرا زرد رخ۔ یہ خشک لب۔ یہ وہم یہ وحشت
تو اپنے سر سے یہ بادل ہٹا لیتی تو اچھا تھا
سنانیں کھینچ لی ہیں سر پھرے باغی جوانوں نے
تو سامان جراحت اب اٹھا لیتی تو اچھا تھا
ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

جب ہندوستان آزاد ہوا اس وقت کتنے ہی شاعروں نے شب گزیدہ سحر، صبح کاذب، اور فریب آزادی، کے عنوانات سے نظمیں لکھی تھیں لیکن ان کا شعور پختہ نہ تھا۔ کیوں کہ آزادی بہر حال آزادی تھی اور انگریزی سامراج ختم ہو چکا تھا۔ پھر انہی شاعروں نے گوا۔ ڈمن۔ ڈیو اور چین کے حملے کے موقع پر اسی فریب آزادی۔ اسی صبح کاذب، اور اسی شب گزیدہ سحر کے لئے جان کی بازی لگا دینے کا عہد کیا۔ مجاز کا سیاسی وسماجی شعور اتنا ناپختہ نہ تھا۔ کہ اس کے خون دل سے بنائے ہوئے نقوش کو محض چند سال کی سیاسی الٹ پلٹ حرف غلط کی طرح مٹا دے۔ وہ تو زیادہ گہرے سیاسی وسماجی شعور رکھتا ہے وہ امید کاروں کی تربیت کو منزل بھی جانتا ہے اور شمع انگیز بھی۔ اس لئے اس کی نظموں میں مثبت ہیں۔ اور وہ تعمیری رجحانات کی حامل ہیں وہ آزادی کو صرف بہار ہی نہیں، بہار پیامی صد بہار راہ سمجھتا ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ

یہ انقلاب کا مژدہ ہے انقلاب نہیں
یہ آفتاب کا پرتو ہے آفتاب نہیں

وہ حسن کی تاب و توانائی کا جواب نہیں
ابھی وہ سعی جنوں خیز کامیاب نہیں
یہ انتہا نہیں آغازِ کار مرداں ہے۔
(پہلا جشن آزادی)

تقدیر کچھ ہو کاوش تدبیر بھی تو ہے
تخریب کے لباس میں تعمیر بھی تو ہے
ظلمات کے حجاب میں تنویر بھی تو ہے
آ منتظر ہے عشرت فردا ادھر بھی آ
(ادھر بھی آ)

اب یہ ارماں کہ بدل جائے جہاں کا دستور
ایک رگ آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور
ایک رگ جسم یہ ہو اطلس و کم خواب سمور
اب یہ بات اور ہے خود چاک گریباں ہوں میں
(عشرت تنہائی)

حالی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ حالی نے انقلاب کا نام لئے بغیر اردو شاعری میں انقلاب برپا کر دیا۔ مجاز کی نظموں میں بھی ایک تعمیری انقلاب کا رجحان پایا جاتا ہے۔ چیزوں کو تباہ کر دینا آسان ہے لیکن ان کی تعمیر مشکل کام ہے۔ اس کے لئے اقبال کے الفاظ میں خون جگر درکار ہے ہے ورنہ تمام نقش بے تمام رہ جاتے ہیں۔ مجاز کی ان نظموں میں بھی سرخی خون جگر جھلکتی ہے۔

شاعر شہر نگاراں کے کلام میں آج بھی خلوص کی گرمی محسوس ہوتی ہے

آج بھی جب ہم اس کی شاعری پڑھتے ہیں تو وہ تازہ نظر آتا ہے۔ اس میں غنائیت کی وہی مترنم بہریں ہیں جن میں عشق کی گرمی ہے اور فلک چاندنی راتوں کی ٹھنڈک۔

مجاز نے کہا تھا ؎

آج بھی ہے لکھی ہوئی سرخ حروف میں مجاز
دفتر شہر یار میں میرے جنوں کی داستان

اسی لئے یہ آج بھی سچ ہے اور بہت دنوں تک سچ رہے گا۔

(باقی صفحہ ۸۲ کا)

مجاز کا درجہ بے حیثیت رومانی شاعر کے بلند ہے اور بہت بلند —— انکی زبان میں مٹھاس ہے۔ وہ محاورات کا صحیح استعمال جانتے ہیں۔ اور تشبیہات واستعارات کا بھی بڑی حد تک واقف کار ہیں۔ پرانے جذبات کو نئے انداز میں پیش کرنے کا انکو خاصہ سلیقہ ہے۔ مجاز نے برائے شعر گفتنی خوب است کے قاعدے پر عشق و محبت کو اپنے یہاں جگہ دینا کبھی پسند نہیں کیا۔ بلکہ عشق و محبت سے ان کی تعمیر ہوئی تھی۔ انھوں نے پیار والفت اپنے ذہن میں رچایا بسایا نہیں تھا بلکہ وہ رچے بسے تھے۔ ایسی لئے ان کی بات دل لگتی ہے اور شاعری وہی کامیاب ہوتی ہے و دل لگتی ہو۔

مجاز کے لطیفے

احمد جمال پاشا

مردم شناس

صاحب نے اپنی نواسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
بھائی مجاز! یہ لڑکی بڑی شریر ہے، مجھے حرامزادہ کہتی ہے۔!
مجاز نے جواب دیا۔
"بڑی مردم شناس معلوم ہوتی ہے۔"

مطالبات

ایک بزرگ نے مسلم یونیورسٹی کی ایک ادبی نشست میں مدعو کرتے ہوئے کہا کہ۔ "آپ کا آنا ضروری ہے۔ نشست زیادہ پر تکلف نہیں ہے صرف چند طالب علم اور کچھ طالبات ہوں گی۔"
مجاز نے وعدہ کر لیا، لیکن کچھ تاخیر سے پہونچے۔ ان بزرگ نے بڑھ کر مجاز کا استقبال کیا اور بولے۔
"آئیے مجاز صاحب! سب طالب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"
مجاز نے جوتے کی ڈوری کھولتے ہوئے کہا۔ "اور طالبات؟"
بزرگ کچھ سٹپٹا سے گئے تو مجاز یک بارگی بول اٹھے۔

"آپ گھبرائیے نہیں، میں اپنے مطالبات نہیں پیش کروں گا۔"

ٹُو وائف

ان کے ایک دوست نے کہا ۔ "مجازؔ میں شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
"کر ڈالو ۔ !" "لیکن میں ایسی عورت چاہتا ہوں جو بیوی اور محبوبہ دونوں
کی جگہ پر سکے ۔"
"اچھا اچھا میں سمجھ گیا ۔" مجازؔ مسکرا کر بولے
"آپ کا مطلب ٹُو وائف سے ہے ۔ !"

بیوہ

ایک مشہور شاعر جب کبھی دوستوں کی محفل میں بیٹھتے تو اپنے کنوارے پن
کا رونا روتے ، ایک بار وہ بڑی حسرت سے بولے ۔
"جوانی گزری جاتی ہے ، جسم میں جان نہیں رہ گئی ہے سوچتا ہوں کہ
کسی بیوہ سے کر ڈالوں ۔"
مجازؔ صاحب جل کر بولے ۔
"بیوہ کی قید کیا ضروری ہے تم شادی کیوں تو وہ ہو ہی جائے گی ۔"

پراکسی

ایک دفعہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں کسی دوست کو پراکسی بولتے
وقت پروفیسر نے پکڑ لیا ۔ اور ناراض ہوتے ہوئے بولے ۔
"کیوں مسز یہ حرکت ! آپ نے دوسرے کی پراکسی کیوں بولی ۔

بُراکسی بولتا ہے

آنا یا جانا

ایک سڑک پر سامنے سے کوئی بُڑّے جنٹلمین الٹا ہیٹ پہنے چلے آ رہے تھے، انھیں دیکھ کر مجازؔ مسکراتے ہوئے بولے۔ "ذرا ان حضرت سے پوچھیں کہ یہ آ رہے ہیں یا جا رہے ہیں؟"

تفتیش

ایک بار مجازؔ کے پڑوس میں چوری ہو گئی۔ تفتیش کے لئے پولیس آئی محلے والے جمع ہو گئے اور موقعِ واردات کے بارے میں اپنی اپنی رائے دینے لگے۔

مجازؔ نے صاحب خانہ سے اظہار ہمدردی ظاہر کرتے ہوئے ان کو مجمع سے الگ لے جاکر بہت ہی رازدارانہ انداز میں بتایا۔

"جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے، تو بھئی ہو نہ ہو مجھے تو یہ کسی چور کی حرکت معلوم ہوتی ہے۔

لاہور

مجازؔ لاہور گئے، لاہور کے ادیبوں اور شاعروں نے ان کی بڑی تواضع کی اور انھیں خوب لاہور کی سیر کرائی۔ رخصت کرتے وقت فیضؔ نے ان سے پوچھا۔

"کہیئے! مجازؔ صاحب آپ کو لاہور پسند آیا"

"ہاں بھئی شہر تو اچھا ہے۔ لیکن یہاں پنجابی بہت ہیں"

ترچھی نظر

کلیم الدین احمد کی کتاب "اردو شاعری پر ایک نظر زیر بحث تھی۔ مجاز بھی بول اٹھے۔ جناب یہ اردو شاعری پر ایک نظر تو ہے مگر یہ ترچھی ہے۔"

کوریا

کوریا میں جنگ کے زمانے میں "پارٹی لائن" کے مطابق ترقی پسند اور ادیبوں نے کوریا پر افسانے نظمیں اور مرثیے لکھنا شروع کر دیے۔ ایک صاحب نے مجاز سے کہا۔

"جناب کوریا پر کچھ لکھیے۔"

"کوریا پر؟" مجاز نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"کاش کہ ایسا ہو سکتا، مجاز نے منہ لٹکا کر کہا۔

"کیوں؟" ۔ مجاز نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولے

"ہائے افسوس، آج ہی گھر میں کوریا نہ ہوا۔"

وضاحت

مجاز تقریر کرنے سے ہمیشہ دامن بچاتے تھے ایک بار انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں لوگوں نے انھیں تقریر کرنے کے لئے کھڑا کر دیا۔

مجاز نے بہت جوش میں آ کر کہا۔

مجاز کی شاعری

احمد ابراہیم علوی

مجاز کی پوری شاعری کا محور حسن وعشق ہے لیکن یہ حسن وعشق اردو کے دوسرے شعرا کے حسن وعشق سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے عشق میں پاکیزگی ہے۔ بلند خیالی ہے اور جواں عزمی ہے۔ وہ عشق اس لئے کرتا ہے کہ کچھ کرنا چاہتا ہے اور حسن پرست اس لئے نہیں ہے کہ وہ محض حسن کی ترجمانی حسین الفاظ میں کرنا چاہتا ہے بلکہ وہ حسن سے کوئی اور کام لینا چاہتا ہے جو اس کے نزدیک سب سے حسین ہے یعنی انقلاب۔ وہ عشق کی مدد لے کر حسن سے انقلاب لانے کی کوشش کرتا ہے اس لئے اس کی شاعری کو محض حسن وعشق کی شاعری کہنا غلط ہے۔ اس کی عشقیہ شاعری میں صرف عشقیہ مضامین نہیں ملتے بلکہ اس میں انقلاب تازہ تر پیدا کرنے کی سازشیں بھی ملتی ہیں۔ وہ عشق ومحبت کی داستان چھیڑ کر صاف صاف کہتا ہے ؎

آ دل کر انقلاب تازہ تر پیدا کریں
دہر پر اس طرح چھا جائیں کہ سب دیکھا کریں

بس یہیں سے اس کی شاعری دوسروں سے مختلف ہو جاتی ہے۔ وہ محبوب کو بلا کر کیف وسرور کے نغمے گانے کی بات نہیں کرتا بلکہ انقلاب تازہ تر پیدا کرنے کی بات کرتا ہے جبکہ ایسے موقعوں پر اردو کے زیادہ تر شعرا حسین نغمہ اور کیف وطرب کی خواہش کرتے ہیں۔

مجاز ایک نراہی بالغ نظر اور بیدار مغز شاعر تھا۔ اسے بے وقت کی راگنی گانے سے چڑھ تھی لیکن فطرتاً حسن پرست پیدا ہوا تھا اور ماحول میں کچھ ایسا ہی پایا تھا اسی لئے اس کی شاعری کا محور تو حسن و عشق ہے مگر انقلاب پرور خیالات کو بڑی حد تک اس میں دخل ہے وہ انقلاب کا پیغا مبر تھا، حسن کا پجاری تھا، عشق کا مریض تھا۔ اس کی شاعری اس کے انقلاب پسند خیالات کا مجموعہ ہے اس کی حسین حسین نظموں میں لطیف درد کی آمیزش کے ساتھ نعرۂ انقلاب سنائی دیتا ہے۔

مجاز کی اپنے معاشرے پر کڑی نظر تھی وہ حالات سے واقف ہوتے ہوئے وقت ضرورت پر اپنی آواز بلند کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اسی لئے وہ عشق و محبت کی داستان سناتا ہے۔ دوشِ ثریا پر سر رکھ کر آلام زمانہ کو بھول جانا چاہتا ہے۔ دل دادگان شعلہ محمل میں موجود ہونے کی خواہش کرتا ہے۔ حسین پیشانیاں رسیلی مدھ بھری آنکھیں اور نرم صوفے گودمیں فردوس رعنائی بے جست پیراہن کہ جن سے نمایاں جسم حسیں کی تراش و خراش والی زہرہ جبیں کی محفل میں جاتا ہے تو جز نورا کے لب لیلی انشاں سے کچھ چراتا بھی ہے شہر کی جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ وحشت دل سے تنگ آکر آوارہ گردی کرتا اور پھر بڑے بھولے پن سے کہتا ہے ؏

عیب جو حافظ و خیام میں تھا

ہاں کچھ اس کا بھی گنہگار ہوں میں

اس کی شاعری میں میٹھا میٹھا درد اور انتظار یار جیسی بے چینی ہے مگر عزم، عالی ہمتی اور بلند خیالی کا فقدان نہیں۔ ان کے یہاں شیر ساز اور جام کی حسین آمیزش ہے کیونکہ یہ جانتا ہے کہ وقت کی آواز پر لبیک کہنا ایک شاعر کا فرض ہے۔ شاعر کا کام حسن، عشق و محبت کے راگ الاپنا ہی نہیں بلکہ اس کا کام معاشرے سے باخبر ہو کر وقت کی آواز پہ لبیک کہنا ہے۔ دراصل ان میں وہ خوبی ہے جو ہم کو

دوسرے شعرا کے یہاں نہیں ملتی۔ ہمارے یہاں اردو شاعری میں تو کچھ ایسا ہے کہ اگر کوئی شاعر زلف یار کی بات لے بیٹھا تو پھر ادھر کی دنیا ادھر بھی ہو جائے وہ زلف گرہ گیر کا اسیر ہی رہے گا۔ بھلے ہی انقلاب آئے، خون کی ندیاں بہیں، قتل عام ہو غارتگری ہو۔ اسی سبب اردو شاعری پر الزام لگایا گیا ہے کہ یہ تو محض گل و بلبل کی داستان ہے۔ اگر مجاز کی شاعری کو اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اس کے یہاں یہ بات نمایاں ملے گی کہ اس نے کبھی بھی زمانے سے رخ نہیں موڑا۔ اس نے کبھی بھی بدلتی ہوئی قدروں کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ وہ ہمیشہ حالات کا جائزہ لیتا رہا اور اسی لئے جب جب ضرورت محسوس ہوئی اس نے اپنی آواز کو بلند کیا اس نے غلامی کے خلاف کھل کر آواز اٹھائی، آمادۂ جنگ ہوا، جدوجہد آزادی میں شامل ہوا، غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انگریزوں کے وفادار مگر ملک کے غدار ہندوستانی راجہ، نوابوں کو بڑے دوستانہ انداز میں باخبر کیا تھا۔

پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شور انقلاب

اور پھر جب اس پر بھی عیش و عشرت کے مزے لوٹنے والے خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوئے تو اسے مجبور ہو کر سخت الفاظ میں کہنا پڑا تھا۔

ختم ہو جائے گا یہ سرمایہ داری کا نظام
رنگ لانے کو ہے مزدوروں کا جوش انتقام
گر پڑینگے خوف سے ایوان عشرت کے ستون
خون بن جائیگی شیشوں میں شراب لالہ گوں

اور اس رنگ میں شمس با ہزاراں آب و تاب
جگمگائے گا وطن کی حریت کا آفتاب

لیکن آگاہ کرنے یا دھمکانے سے کیا ہوتا ہے جبکہ آگاہ کرنے والا خود خطرے سے اچھی طرح آگاہ نہ ہو اور خود دھمکیوں سے بے خوف و خطر ہو کر ڈٹ

کر مقابلہ نہ کر سکتا ہو اسی لئے اس نے اپنے سے کہا ؎

فنا کے آہنی وحشت اثر قدموں کی آہٹ ہے

دھوئیں کی بدلیاں ہیں گولیوں کی سنسناہٹ ہے

اجل کے کئی قہقہے ہیں زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے

مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

آگاہ کرنے والا دھمکیاں دینے والا خود اتنے آہنی عزائم کا انسان ہے کہ فنا کے آہنی وحشت اثر قدموں کی آہٹ گولیوں کی سنسناہٹ، اجل کے قہقہے اور زلزلوں کی گڑگڑاہٹ اس کے پایۂ استقلال میں جنبش نہیں لا سکتے مگر وہ اتنے پر ہی قناعت نہیں کرتا وہ تو اپنے استقلال کو برقرار رکھنے کے لئے دوسروں سے کچھ اور سیکھنا چاہتا ہے اس لئے جب ترکی کی مشہور ریاست داں خاتون خالدہ ادیب خانم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آتی ہیں تو وہ اپنی غلامی اور محکومی پر اظہار صد ندامت و افسوس کرتے ہوئے انداز فاتحانہ سیکھنے کی خواہش کرتا ہے ؎

ہاں بتا دے ہم کو بھی اے روحِ ارباب نیاز

کس طرح مٹتا ہے آخر رنگ دخوں کا امتیاز

دل پہ کیونکر فاش ہو جاتے ہیں آزادی کے راز

چھیڑتے ہیں کس طرح محفل میں بیداری کا ساز

تیری آنکھوں میں سرورِ عشرتِ جمہور ہے

آہ! یہ جوہر ہماری دسترس سے دور ہے

جب وہ ملک پر ایک طائرانہ نظر دوڑاتا ہے سیاسی حالات کا جائزہ لیتا ہے تو اسے بڑی محرومی ہوتی ہے بڑا دکھ ہوتا ہے اور ایک کرب کے ساتھ اس کے منھ سے نکلتا ہے۔ "آہ" ـــ کس قدر سوز ہے کیوں نہ ہو وہ عظیم عزائم کا انسان ہے جوش

اور ولولہ رکھتا ہے لیکن اس کا ملک ہندستان غلامی کی زنجیروں میں نہ صرف بری طرح جکڑا ہوا ہے بلکہ جکڑا رہنا چاہتا بھی ہے کیونکہ چھوٹے چھوٹے راجہ، نواب اور زمیندار محض اپنے عیش وعشرت کو برقرار رکھنے کے لئے اپنے ناجائز مالک انگریزوں کے وفادار غلام بن کر اپنے ہی ملک کے عوام پر ظلم ڈھا رہے ہیں ایسے میں آزادی کی کیا امید کی جا سکتی ہے سوائے یاس وحسرت کے اور کیا ہو سکتا ہے اس لئے وہ نہایت کرب اور یاس وحسرت کی آمیزش کے ساتھ کہتا ہے ؎

آہ! یہ جوہر ہماری دسترس سے دور ہے

لیکن ایک باشعور ذی ہوش اور حساس شاعر محض کرب محسوس کر کے یاس وحسرت کی آمیزش سے کوئی بات کہہ کر ہمیشہ کے لئے خاموش نہیں ہو سکتا۔ مجازؔ ہندوستان کی حالت سے بخوبی واقف ہوتا ہے اسے آئے دن کے مظالم سے نہایت دکھ ہوتا ہے وہ دل کی گہرائی میں ڈوب کر خود سے کچھ سوال کر کے جواب چاہتا ہے مگر بے سود مانہیں ہوتا اس کا ملک غلام ہے جد وجہد برائے حصول آزادی جاری ہے اس لئے اسے اچانک جوش آتا ہے وہ کہتا ہے ؎

فطرت دل دشمن نغمہ ہوئی جاتی ہے اب
زندگی اک برق اک شعلہ ہوئی جاتی ہے اب
سر سے پا تک ایک خونی راگ بن کر آؤں گا
لالہ زار رنگ وبو میں آگ بن کر آؤں گا

لیکن محض اس کے آگ برسانے سے کیا ہوتا جبکہ سارا ہندوستان اس کے ساتھ نہ ہو لہذا وہ عوام کو مخاطب کرتا ہے ؎

کوئی لاکھ روکے کوئی لاکھ ٹوکے — قدم اپنا آگے بڑھاتا چلا جا
قدامت مدیں کھینچتی ہی رہے گی — قدامت کی بنیاد ڈھاتا چلا جا

جو پرچم اٹھا ہی لیا سرکشی کا
اسے آسماں تک اڑاتا چلا جا

صرف اتنا ہی نہیں اس کا خون کھول اٹھتا ہے وہ دشمنوں کی صفوں پر آگ برسانا چاہتا ہے اس لئے وہ صرف نعرہ ہی نہیں لگاتا بلکہ جب اپنی ضرورت محسوس کرتا ہے تو وہ یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ لوگ اسے محض میکش، آوارہ و آشفتہ مزاج سمجھتے ہیں وہ میدان جنگ میں میکدہ چھوڑ کر شمشیر بکف آتا ہے ؎

میکدہ چھوڑ کر میں تیری طرف آیا ہوں
سرفروشوں سے میں باندھے ہوئے صف آیا ہوں
لاکھ ہوں میکش و آوارہ و آشفتہ مزاج
کم سے کم آج تو شمشیر بکف آیا ہوں

اس طرح مجاز کی شاعری کا ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو اس بات کا بری طرح احساس ہوگا کہ اس کے یہاں شمشیر کی لچک ہی نہیں کیونکہ اس کی عشقیہ شاعری بھی محض عشقیہ شاعری نہیں۔ اس کے یہاں ہوسناکی نہیں، بے اعتدالی نہیں وہ حسن پرست ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ کسی حسین عورت کو دیکھتا ہے تو قدیم شعرا کی طرح اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر نہیں ہوتا کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ انقلاب تازہ کو پیدا کر سکتی ہے کیونکہ اس کا آنچل ایک پرچم بن سکتا ہے۔

مجاز کے لطیفے

صفحہ ۸۴ کا بقیہ

"حضرات!
عام طور پر لوگ جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کا خواب دیکھتے ہیں مگر چونکہ ہم لوگ ترقی پسند ہیں اس لئے محلوں میں رہ کر جھونپڑوں کا خواب دیکھتے ہیں۔"

کچھ مجازؔ کے بارے میں

شبیر علوی

بات کچھ پرانی ہو چلی ہے۔ یادیں بھی کچھ دھندلا چلی ہیں، لیکن اتنا یاد ہے کہ وہ شام شاید ۱۹۴۲ء کی ایک خزاں آلود شام تھی جب کہ مجازؔ سے میری پہلی ملاقات لکھنؤ یونیورسٹی کے طالب علم مسٹر حنیف فوقؔ کے رہائشی دو منزلہ کمرے واقع حضرت گنج میں ہوئی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم یونیورسٹی کی سیاسات سے متعلق کچھ نیم سنجیدہ باتوں میں مشغول تھے کہ اتنے میں ایک دبلا پتلا اجاڑ سا شخص کھدر کے کرتے اور پاجامے میں ملبوس بغیر کسی جھجک کے کمرے کے اندر داخل ہوا کہ آپ ہیں اسرار الحق مجازؔ۔۔۔!

ہم اس وقت یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ لیکن مجازؔ کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس لئے ہم لوگ جلد ہی بے تکلف دوست بن گئے۔ اور مجازؔ یونیورسٹی کی لڑکیوں سے لے کر دنیا کے ہر مسئلہ پر اپنے مخصوص انداز میں گفتگو کرنے لگا۔ کمرہ قہقہوں سے گونجنے لگا۔ مجاز حسب دستور لاتعداد لطائف و ظرائف سنانے میں مشغول تھا۔ اس وقت لکھنؤ یونیورسٹی کی بعض معروف و غیر معروف لڑکیاں اور ان کے طرح طرح اسکینڈلس مجازؔ کا محبوب موضوع سخن تھا۔ باتوں باتوں میں وقت کا احساس نہ رہا۔ یوں بھی مجازؔ کی دلچسپ گفتگو میں لوگ عموماً دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جایا کرتے تھے اس لئے ہم اس وقت چونکے جب نیچے حضرت گنج میں روشنیوں کا سیلاب امنڈ آیا۔ نیچے فضا نور و نکہت میں ڈوب گئی

"گنج" ہر شام کی طرح دلچسپیوں کا مرکز بن کر دعوت نظارہ دینے لگا۔ اب شام اودھ اپنی تمام جولانیوں کے ساتھ موجود تھی۔ اب کمرے کے اندر بیٹھے رہنا انتہائی بدذوقی تھی۔ بالخصوص مجاز ایسے خوش فکر و خوش ذوق کے لئے تو یہ جرم کسی طرح قابل معافی نہ تھا جب کہ وہ خود ایک دوست کی خوش مزاقی پر طنز کرتے ہوئے کہہ چکا تھا۔ ؎

حسن فطرت کی لطافت کا جو تو قائل نہیں
میں یہ کہتا ہوں تجھے جینے کا حق حاصل نہیں

ہم لوگوں کو پوری طرح باہر نکلنے پر آمادہ نہ پاکر وہ کسی بہانے سے چلا گیا۔ ویسے ہی شام مجاز کے لئے کچھ عجیب کرب و بے چینی کا پیغام لے کر آتی تھی۔ اور وہ بے قابو ہوجاتا تھا۔ کیونکہ مغرب کے بعد بالعموم شعر و شاعری نغمۂ و نکہت کا یہ پجاری اپنے غم غلط کرنے کے لئے غم دل اور وحشتِ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر سوچنے لگتا تھا کہ

دل میں ایک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں!
زخم سینے کا مہک اٹھا ہے آخر کیا کروں!
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

اور مجاز انھیں خیالات پریشاں میں ادھر ادھر ادھر آوارہ پھرنے لگتا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اپنے ہم مشرب مل جاتے تھے اور بالآخر وہ بقیہ رات کسی میخانے میں گذار کر زندگی کی تلخیوں کو وقفِ مئے انگیں کر دیا کرتا تھا،.... تو یہ تھی مجاز سے میری پہلی ملاقات!

اس پہلی اتفاقیہ ملاقات کے بعد مجاز سے کبھی حضرت گنج، کبھی یونیورسٹی کے

شعبہ اردو، کبھی انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں برابر ملاقات ہوتی رہی
اور اس کا وہی دلچسپ انداز قائم رہا۔ لیکن اس شام کی طرح طویل نشست کا موقع
نہ مل سکا۔ اسی اثناء میں ہم لوگوں نے خلیق ابراہیم، اشفاق ہاشمی اور مجازؔ کے ساتھ
مل کر ہم "نوگیا" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ نکالنے کی تیاریاں شروع کر دیں جس میں
مجازؔ نے پوری پوری عملی دلچسپی کا ثبوت دیا اور دن رات ایک کر کے ہندوستان
کے تمام ادباء و شعراء کو خطوط لکھے۔ اس سلسلہ میں متواتر شب و روز مجازؔ کے ساتھ رہنے،
اٹھنے بیٹھنے اور گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا۔ اس زمانے میں گولہ گنج میں "بھیروں کا
مندر" ہم لوگوں کی ادبی کوششوں کا صدر مقام تھا، جہاں دن بھر کی دوڑ دھوپ
اور کاوش و جد و جہد کے بعد ہم سب جمع ہوا کرتے تھے اور دن بھر کے کام کا جائزہ
لیا جاتا تھا۔ مجازؔ بھی اس سلسلہ میں ہر طرح اور ہر وقت ایک معمولی رضاکار یا کارکن
کی طرح ہم لوگوں کا شریک کار تھا اور اسی وقت مجھے مجازؔ کو بہت قریب سے
دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ بہت اچھا اور پیارا دوست اور بے حد مخلص انسان
تھا۔ ادبی دنیا میں وہ نہ صرف ہر شخص سے متعارف تھا بلکہ اس وقت کی تمام بڑی
بڑی ادبی شخصیتوں سے اس کے بڑے ہی بے تکلفانہ اور برادرانہ مراسم تھے۔ خود
بھی ایک مستند اور متعین ادبی حیثیت کا مالک بن چکا تھا جس پر فخر کرنا تو کجا، اس
کا ذکر بھی اسے نامناسب معلوم ہوتا تھا۔ اس اعتبار سے مجازؔ عجز و انکساری کی
ایک اچھی مثال بن چکا تھا۔ کہنے کو تو وہ دورِ حاضر کے ان چند جواں سال و جواں بخت
شعراء میں سے تھا جن کو اپنی زندگی ہی میں بہت کافی ادبی شہرت و عظمت حاصل
ہو چکی تھی جس کو ان کی زندگی ہی میں گھر گھر پڑھا اور پسند کیا جانے لگا تھا جو طبقۂ
نسواں میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ لیکن در اصل وہ بڑا ہی بدقسمت انسان تھا۔
کیوں کہ شاعرانہ عظمتوں اور نزاکتوں کے اس تمام تر اعتراف، شہرت، نیک نامی

کے باوجود یہ امر بھی کچھ کم المناک نہیں ہے کہ اس کی زندگی معاشی اعتبار سے ایک بڑی دکھ بھری کہانی ہے ۔ اس کی پوری زندگی ایک خوش آئند مستقبل کے سنہرے خواب دیکھنے اور معاشی طور پر ایک بہتر زندگی گزارنے کی توقع کی نذر ہو گئی ۔ وہ چاہتا تھا کہ دنیا نہ صرف ان کے اشعار پر سر دھنے بلکہ یہ اعتراف الفاظ کے کھوکھلے جاموں سے نکل کر زندگی کے مستحکم اور پائیدار تقاضوں میں بدل سکے جس کے متعلق عصمت چغتائی نے اپنے مضمون میں کہا تھا کہ "محفل خوباں میں شاعر کو تو جی بھر کے داد ملی پر وہ ناکارہ انسان جو اس کے لینٹ کے پیچھے چھپا ساتھ چلا آیا تھا، خالی ہاتھ ٹرخا دیا گیا شاعر نے "واہ" کی آرزو کی مل گئی انسان "آہ" جسکی تمنا کی، وہ نہ ملی ۔ اور جب انسان کی ہار ہوئی تو شاعر بھی کھیا رو پڑا " اور یہی اس زندگی کا سب سے بڑا اور سب سے سچا المیہ ہے ۔ اس کی امیدیں پوری نہ ہو سکیں ۔ اسے یکے بعد دیگرے ناکامیوں کا منھ دیکھنا پڑا ۔ ماہ و سال بیتتے گئے اور اس کی ایک بہتر زندگی گزارنے کی تمام تر آرزوئیں آرزوئیں ہی بن کر رہ گئیں لیکن پھر بھی فنی طور پر غنیمت یہ ہے کہ زندگی کی یہ ناکامیاں، نامرادیاں اور پیہم شکستیں اور معاشی اعتبار سے دیو لئے پن نے اس کی فطری خوش طبعی، تیزی و ذہانت پر کوئی فوری برا اثر نہیں ڈالا ۔

خوب پہچان لو اسرار ہوں میں
جنس الفت کا طلب گار ہوں میں

چھیڑتی ہے جسے مضراب الم
ساز فطرت کا وہی تار ہوں میں

عیب جو حافظ و خیام میں تھا
ہاں کچھ اس کا بھی گنہ گار ہوں میں

مجاز موجودہ سماج اور اس کے گھنونے ماحول کا بری طرح سے شکار رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے اپنے کلام میں اس نظام کے خلاف وہ تلخی پیدا ہونے نہ دی جس کو ہم بہت ہی تلخ و ترش سمجھ کر اپنے لئے ناقابلِ قبول سمجھ بیٹھے یا جس سے اس کی شاعرانہ لطافتوں پر کوئی اثر پڑتا۔ یا جس سے اس کے اشعار کی شیرینی پھیکی یا بدمزہ معلوم ہونے لگتی وہ ایک نئے سماج کا امیدوار ہی نہیں بلکہ اس کا پیغام بر اور علم بردار بھی تھا۔ ایک نئی صبح اس کے لئے بمنزلہ ایمان تھی۔ اس کے لئے یہ بات کافی طمانیت بخش تھی کہ ؂

ذہن انسانی نے اب اوہام کے ظلمات میں
زندگی کی سخت طوفانی اندھیری رات میں
کچھ نہیں تو کم سے کم خواب سحر دیکھا تو ہے
جس طرف دیکھا نہ تھا اب تک ادھر دیکھا تو ہے

مجازؔ کو اس بات کا پختہ شعوری احساس تھا کہ آج کی طبقہ دارانہ بے عہدیوں، ناانصافیوں اور مظالم سے صرف اسی وقت نجات حاصل ہو سکتی ہے جبکہ یہ پورا کرم خوردہ نظام بدل دیا جائے تاکہ ایک نئے سماج میں یہ ناانصافیاں نہ ہوں جہاں ایک محبوب عوامی شاعر کے خون جگر کا معاوضہ صرف چند کھوکھلے قہقہوں اور روکھے پھیکے ستائشی کلمات ہی تک محدود نہ رہ جائے بلکہ خون جگر صرف کرنے والے شاعر کو بھی انسان سمجھا جائے۔ اور اس کی قدر و قیمت بھی اچھی بہتر اور خوش حال زندگی گزارنے کے سلسلہ میں صحیح طور پر سمجھی جائے۔ اس نے اپنی ذاتی زندگی کے سارے تجربات، تلخیاں، زمانے کی بے مہریاں، جماعتی احساسات میں سمو کر خوش آہنگ انداز میں سماجی بے انصافیوں کے خلاف آواز بلند کرنے میں صرف کر دیں۔

مجازؔ کا کمال اس بات میں مضمر ہے کہ پوری زندگی ایک حسرت ناک الم کی اور مایوسی کے ساتھ گزارنے کے باوجود اس نے اس سماج کو قابلِ رحم سمجھتے ہوئے اس پر قہقہہ لگانا سیکھا تھا، اس نے کبھی نفرت، غصے یا تلخی کو اپنے قریب بھی آنے نہیں دیا۔ وہ صرف قہقہے لگانا اور مسکرانا جانتا تھا اور چاہتا تھا کہ کوئی انسان مغموم نظر نہ آئے بلکہ سب لوگ مسکرائیں، ہنسیں اور تلخیوں کا مردانہ وار مقابلہ کریں، کیونکہ اسے یہ یقین تھا کہ یہ نظام بہت جلد ختم ہونے والا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی ساری تلخیاں اور سختیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔ مجازؔ ایک دلچسپ اور محبوب گیر بائی شخصیت کا مالک تھا اور دوستوں کا بڑا مخلص دوست تھا، دشمن اس کا کوئی تھا ہی نہیں، اس لئے دشمنوں کے ساتھ طرزِ عمل اس نے کبھی جانا ہی نہیں۔ وہ جس بزم میں جتنی دیر کے لئے بھی بیٹھ جاتا تھا، وہ مستقل زعفران زار بن جایا کرتی تھی۔ قہقہے اس کے جلو میں چلا کرتے تھے۔ انسانی ہمدردی کا جو احساس اس کو تھا، وہ کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ اپنی عظمت اور شاعرانہ خلاقی اور ادبی دنیا میں اپنے واضح مقام سے بے تعلق اور غالباً بے پروا اور لاعلم محض تھا۔ کوئی شخص بھی چند لمحوں میں اس کی ہمدردیاں اور دوستی جیت سکتا تھا اور پھر وہ اس کا گہرا دوست بن جایا کرتا تھا۔ ایک بار دوست بن جانے کے بعد وہ کاروباری قسم کی تمام تر باتوں سے بالا ہو جایا کرتا تھا۔ مشاعرے اس کی زندگی میں واحد ذریعہ معاش کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس سلسلہ میں کبھی وہ دوسرے پیشہ ور شعراء کی طرح کاروباری انداز کا قائل نہ تھا۔ اکثر وبیشتر مروّت کے ہاتھوں میں رہتا تھا۔

مجازؔ نے اپنی رومانی طبیعت کے تخیلی تقاضوں کے تحت زندگی کے بڑے حسین خواب دیکھے اور ان کی تعبیر دیکھنے کا اسے بڑا ارمان تھا۔ ؎

دیوانہ وار ہم بھی پھرے کوہ دشت میں
دلدادگان شعلۂ محمل میں ہم بھی ہوں!
دل کو ہوئی شاہزادی مقصد کی دھن لگی،
حیران سراغ جادۂ منزل میں ہم بھی ہیں
صحرا ہو، خار زار ہو، وادی ہو آگ ہو!
اک دن انھیں مہیب منازل میں ہم بھی ہوں

اور اسی کے ساتھ زندگی کو سنوارنے اور بنانے کے صدہا خواب و خیال تھے لیکن خواب و خیال کے یہ تانے بانے ٹوٹ گئے اور بکھر گئے۔ پہلے پہل اس کی نظمیں خالص رومانی نظمیں ہوا کرتی تھیں جن کا رومان بھی بڑا ہی شریف اور مخصوص حدود کا قائل تھا۔ اپنی ایک نظم "مجبوریاں" میں وہ خود کچھ اسی قسم کی مجبوریوں کا تذکرہ کرتا ہے ؎

وہ مجھ کو چاہتی ہے اور مجھ تک آ نہیں سکتی
میں اس کو پوجتا ہوں اور اس کو پا نہیں سکتا

یہ مجبوری سی مجبوری یہ لاچاری سی لاچاری،
کہ اس کے گیت بھی جی کھول کر میں گا نہیں سکتا

زباں پر بے خودی میں نام اس کا آ ہی جاتا ہے
اگر پوچھے کوئی یہ کون ہے؟ بتلا نہیں سکتا!

لیکن رفتہ رفتہ وقت کی رفتار، ملک کی عام سماجی حالت اور ذہنی ارتقا کے ساتھ ساتھ اس کا شعور اور احساس و ادراک بھی ترقی کرتا گیا۔ اس لئے اس نے اپنی خالص رومانی نظموں کو تفکرانہ آنچ کے نیم رومانی، نیم انقلابی لے میں پیش کرنا شروع کیا اور یوں اس کی نظمیں زیادہ گہرائی و گیرائی کی حامل نظر آنے میں سماجی شعور کا واضح احساس نظر آنے لگا۔ اس کی نظموں کا رنگ و آہنگ، خالص انفرادی تھا جن کی بنا پر انھیں متفرق و مختلف

متعین حیثیت حاصل تھی، اور یہ رنگ ہر جگہ واضح ہے۔ اس کی نظموں میں انقلاب کی گھن گرج نہیں ہونے پاتی تھی، بلکہ انقلابی نظموں کو بھی دھیمے سروں میں پیش کر کے عام آدمی کو اس کی ہولناکیوں سے ڈرانے، آگ و خون و تباہی کے خوفناک مناظر دکھانے کے بجائے میٹھی لے اور ہلکی آنچ کی خوشگوار سرخی میں پیش کیا گیا تھا۔ انقلاب کے متعلق اس کا نظریہ کسی انارکسٹ یا تشدد پسند کا نظریہ تباہی نہ تھا، بلکہ انقلاب کے متعلق اس کا نظریہ تخلیق ابراہیم کے اس نظریہ سے ملتا جلتا تھا کہ ؎

بن سنور کر جو انقلاب آئے!
مالا پہنائے گی عروس حیات!

اسی لئے وہ کہتا ہے کہ: ؎

دیکھ شمشیر ہے، یہ ساز ہے، یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھا لے تو بڑا کام ہے یہ

اسے پوری طرح احساس تھا کہ آج کے دور میں صرف جام رنگیں و نغمۂ ارغواں ہی سب کچھ نہیں ہے اور اب وقت کے تقاضوں کے پیش نظر شمشیر اٹھانا ہی دانشمندی ہے۔ وہ اپنی محبوبہ کے ماتھے پہ آنچل دیکھ کر فطری طور پر اس کے حسن کی افزائش کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا، اس سے بلاشبہ اس کے حسن کو چار چاند لگ جاتے ہیں، لیکن وقت کی اس پکار کا تقاضا وہ اس میں مضمر سمجھتا ہے اس کی محبوبہ اسی آنچل سے ایک پرچم بنا لے، معلوم نہیں اس کا یہ مطالبہ کس حد تک درست یا نفسیاتی ہے ؎

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مجازؔ کی شعریت کا سب سے بڑا حسن یہ ہے کہ وہ زندگی کے تیقن اور نظم پاتی

شعور کے اظہار کے باوجود وہ اپنی غزلوں میں غزل کی ساری ضروریات و خصوصیات
کا پوری طرح التزام کرتا ہے اور کہیں بھی اس کے آہنگ میں فرق نہیں آنے دیتا۔
فیض نے اس کے مجموعۂ کلام پر اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "مجاز بنیادی طور پر اور طبعاً
غنائی شاعر ہے۔ اس کے کلام میں خطیب کے نطق کی گرمی نہیں، باغی کے دل کی آگ
نہیں، نغمہ سنج گلے کا وفور ہے۔ یہی وفور مجاز کے شعر کی سب سے بڑی خوبی ہے، اس
کے شعر کی کامیابی کا سب سے بڑا امین بیچ کے ایک مختصر سے دور کے علاوہ مجاز ہمیشہ
سے گاتا رہا ہے۔ اس کے نغموں کی نوعیت بدلتی رہی ہے، لیکن اس کے آہنگ میں
میں فرق نہیں آیا ہے۔" اسی طرح سجاد ظہیر نے مجاز کی شاعری پر اظہار خیال کرتے
ہوئے کہا تھا کہ "اچھی شاعری صرف انقلابی شاعری ہو سکتی ہے۔ یہ شاعری زندگی
کے حقائق پر اپنی بنیاد رکھتی ہے۔ یہ ادب باب نفس کے نازک تاروں کو چھیڑ کر جذبات کے
تلاطم خیز مادے سے اس طلسماتی دنیا کی تعمیر کرتی ہے جہاں ادراک پر سے تعصب اور جہالت
کے پردے ہٹنے لگتے ہیں۔" سجاد ظہیر کی رائے سے بحیثیت مجموعی اختلاف ممکن ہے، لیکن
مجاز کی انقلابی شاعری کے متعلق ان کی رائے بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے۔
کیوں کہ مجاز کی انقلابی شاعری انقلاب کے تمام تر محرکات و پیام کے باوصف
تغزل کے معیار پر بھی پوری اترتی ہے۔ اس لئے اچھی انقلابی شاعری کا اعلیٰ نمونہ کہی
جا سکتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جو شخص ان نظموں، غزلوں کو پڑھے گا، وہ یہ بھی محسوس
کرے گا کہ عروس سخن نے بھی اب ہمارے ہی ساتھ رہنا قبول کر لیا ہے۔ تہذیب و تمدن
کی دلہن کا لباس اب ریشمی نہیں کھدر پہنے ہوئے ہے، وہ قصر امراء کی آرام دہ خلوت
سے پیچھا چھڑا کر سیلاب حیات کے منجدھار میں پڑنا زیادہ پسند کرنے لگی ہے۔" حالانکہ اچھی
شاعری کے ناتے ہمیشہ سرگرم سرفروشوں اور جہد حیات میں مستقل دیا بہ دادحصہ لینے
سے رہے ہیں، یہ آج کوئی نئی بات نہیں، اور جب ہماری شاعری کا درباری دور
سے تعلق تھا، اسوقت بھی اس پر تصنع و پرتکلف پیرائے کے مقابلہ میں سلیس و عام فہم شاعری

کی اپیل زیادہ تھی، لیکن اس بحث سے قطع نظر مجازؔ کی انقلابی و رومانی شاعری یقیناً آپ کے لئے بڑی گنجائش رکھتی ہے۔

مجازؔ...... طبقۂ نسواں کا مقبول شاعر...... جب عملی زندگی میں قدم رکھنے کے لئے اپنے محبوب سے ایفائے وعدہ کا طالب ہوتا ہے تو کوئی بھی اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ جب معاملہ کھلے طور پر معاشی مجبوری پر آکر ٹھہر تو سب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ احساس کوئی معمولی حادثہ نہ تھا۔ لیکن بہر حال وہ اس کو بھی کسی نہ کسی طرح جھیل گیا۔

مجازؔ نے اقرار کیا ہے کہ اس نے اپنی جوانی خاک میں ملائی، شعلہ زاروں میں جلائی ہے، یا شہر خوباں میں گنوائی ہے۔ اس کے پیمان محبت نے سپر بھی ڈالے ہیں، لیکن یہ جوانی بالآخر برباد جام و صہبا ہو گئی ؎

وہ جوانی کہ تھی حریف طرب

آج برباد جام و صہبا ہے!

نئی زندگی اور نئی صبح کے متعلق اس کا یقین بڑھتا گیا۔ وہ محبوب کی بے وفا ہوس سے تنگ آکر اس پورے معاشرے کے خلاف جنگ میں شامل ہو جاتا ہے جو ان تمام بے وفائیوں کا ذمہ دار تھا جہاں دو دھڑکتے ہوئے دل آپس میں ملنے نہیں دیے جاتے۔ چنانچہ یہ یقین "اندھیری رات کا مسافر" میں اور بھی واثق ہو جاتا ہے۔ مسافر یعنی انسان ظلم و بربریت اور انسانیت ناشناسی کے باوجود جو ذہن انسانی پر مہیب تاریکی بن کر چھا گئی ہے۔ اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہے اور کوئی طاقت اس کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ وہ ان سب سے بے پروا، اپنی جد و جہد جاری رکھتا ہے اور اپنی منزل کی طرف گامزن ہے ؎

انی پر جینے کا خونیں ستارہ جگمگاتا ہے!

ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے!

گھٹا کی گھن گرج سے قلب گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

اپنے محبوب کی تعریف کرتا ہے تو کہتا ہے کہ ؎

برہمن تیرے ہیں کل ملت اسلام تری
صبح کاشی تیری حسین شام تری

جب وہ اسی محبوب کو حسن و جوانی کی دعائیں دیتا ہے تو اس کو خطاب کرتے ہوئے کہتا ہے ؎

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زور شباب اور زیادہ!

نظموں کا یہی عاشق دلدادہ جب خالص تغزل پر آتا ہے تو کہتا ہے ؎

تسکین دل محزوں نہ ہوئی وہ سعی کرم فرما بھی گئے
اس سعی کرم کو کیا کہئے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے!

بتانے والے وہیں پر بتاتے ہیں منزل
ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں!

واعظ سادہ لوح سے کہدو چھوڑے عقبیٰ کی باتیں
اس دنیا میں کیا رکھا ہے اس دنیا میں کیا ہوگا

مجاز کے یہاں کامیاب رومانی و نیم نظموں اور خالص عاشقانہ منزلوں کے ساتھ اس کے یہاں بڑے اچھے کامیاب اور پر اثر قطعات بھی ملتے ہیں۔ ایک قطعہ کے ذریعہ اس نے اپنی موت کی پیشین گوئی کرتے ہوئے کہا تھا ؎

زندگی ساز دے رہی ہے تجھے
سحر و اعجاز دے رہی ہے تجھے
اور بہت دور آسمانوں سے
موت آواز دے رہی ہے تجھے

کتنی بے جرانہ شان ہے گویا اسے آنے والے آخر وقت کی بھنک پہلے سے مل گئی ہو۔ پیری و جوانی کے متعلق اس کا میلان طبع اور طرز فکر سب سے جدا ہے سہ

جوانی کی نگاہیں دیکھتی ہیں عین مستی میں
اجل کا وحشیانہ رقص عرصہ گاہ ہستی میں
ضعیفی محفلِ عشرت سے خرقہ پوش آتی ہے
جوانی جب آتی ہے کفن بردوش آتی ہے

ایک ذہین اور پختہ کار شاعر کے یہاں موضوع اور ہئیت دونوں کا خوبصورت اور متوازن امتزاج ضروری ہے۔ اگر کوئی نظم فن کارانہ طور پر خوبصورت ہے لیکن موضوع کی گرمی کا احساس نہیں ہوتا تو ہمیں اس فن کار کی عظمت کا احساس بھی نہیں ہو سکتا ہے اگر حکیمانہ انداز موجود ہو۔ مگر فن کی وہ بلندیاں نہ ہوں جو ہمارے جذبات و احساسات کے سارے تاروں کو چھو سکیں تو ہم اسے بھی صحیح معنوں میں شاعر اور فنکار ماننے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ مجاز نے اپنی بہت سی نظموں اور غزلوں میں فن کے متناسب نظریہ کو بڑی ہی کامیابی و خوش اسلوبی سے برتا ہے۔ اور میرے خیال میں یہی اس کی عظمت کا سب سے بڑا راز ہے۔ مجاز کے فن اور شعور کے سلسلہ میں اس بات کا تذکرہ بھی بہت اہم اور ضروری ہے کہ جس دور میں مجاز انتہائی جوش و خروش اور خلوص کے ساتھ اپنے فن کو نکھارنے اور سنوارنے میں مصروف تھا۔ وہ دور جذباتی انتہاپسندی کا دور تھا۔ جس کے تحت اکثر شعراء ایسی رمزیہ شاعری کرنے لگے تھے جو بالکل مبہم اور بے مقصد

اور اسی لئے اس شاعری میں بالعموم قنوطیت یا مریضیت چھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ جو ظاہر ہے زندگی اور فن دونوں کے حق میں سم قاتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ مجازؔ کے یہاں تو کبھی اس قسم کے الہام۔ قنوطیت اور مریضیت کا گذر ہوا اور نہ بعض دوسرے شعرا کی طرح وہ ہنگامی موضوعات کا شکار ہوا۔ اور غالباً اس سلامت روی اور توازن کا راز یہ ہے کہ مجاز کو ترقی پسند نظریہ فن کا صحیح علم اور ادراک تھا۔ اور وہ صحیح ترین معنوں میں ایک ترقی پسند فن کار تھا۔ اور فن و زندگی دونوں پر اس کی گرفت کافی مضبوط تھی۔ اس کے یہاں اس قدر فنی انفرادیت موجود ہے کہ کسی نئے شاعر کی آواز پر اس کی آواز کا شبہ بھی نہیں ہوتا اور نہ اس کی آواز پر کسی دوسرے کی آواز کا دھوکہ ہوتا ہے۔ کسی ادیب و شاعر کی کامیابی و فنی پختگی کے لئے اتنی واضح انفرادیت بلاشبہ ایک بڑی قابل ذکر بات ہے۔

آج سے پانچ سال قبل نئی زندگی کا یہ علمبردار کچھ تو اپنے سماجی حالات اور کچھ ان کے لازمی نتائج یعنی اپنی خود کردہ بے راہ رویوں اور اعتدال سے بڑھی ہوئی مے نوشی کے ہاتھوں، وقت سے بہت پہلے۔ ۵ر دسمبر ۱۹۵۵ء کو بلرامپور اسپتال میں کسمپرسی کے عالم میں دامن جھاڑ کر سب سے روٹھ کر روپوش ہوگیا۔۔۔۔ اسکی موت ہمارے ناخوشگوار سماجی حالات پر ایک بڑا اشد بد طنز ہے۔

بقیہ شامِ غریبانِ لکھنؤ

ہوں تو مجاز کی یاد منانا مبارک ورنہ ایک رسم ہے جس کو نبھایا جائے یا نہ جائے

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبح نو مجازؔ
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

شامِ غریبانِ لکھنؤ

عثمان غنی

ہم پہ ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

مجازؔ مرحوم کا یہ مصرعہ آج ایک ایسی تلخ حقیقت بن گیا ہے جو شاید مجازؔ کے ذہن میں نہ ہوگی۔

مجازؔ کا لکھنؤ ادیبوں کے اس گروہ کا آخری میدان تھا جو کسی آرزو اور تمنا کے سہارے بحیثیت گروہ کے زندہ رہتے ہیں۔

ان کے عہد کے لکھنؤ میں، جو ایک غلام ملک کا غلام شہر تھا چند ایسے سر پھرے ادیب جمع تھے جنھوں نے آندھیوں میں آرزو کی قندیل روشن کی۔ سردار جعفری، سبطِ حسن، پروفیسر احمد علی، ڈاکٹر رشید جہاں، ڈاکٹر علیم وغیرہ جن آندھیوں سے یہ ادیب لڑتے رہے انہی آندھیوں کے متعلق مجازؔ نے کہا تھا ——— ہم پہ ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ۔ مجازؔ کا خیال تو یہ تھا کہ شامِ غریباں ختم ہوتے ہی صبح نو طلوع ہوگی لیکن ادب کے میدان میں لکھنؤ میں تو یہ صبح نمودار نہ ہوئی اور لکھنؤ ادب کے میدان دن بدن پیچھے ہی ہٹتا گیا۔

آج جب ہم مجازؔ مرحوم کی برسی منا رہے ہیں یہ خیال بھی شدت سے

آتا ہے کہ وہ صبح تو جس کے طلبگار مجازؔ اور ان کے ساتھی تھے کب لکھنؤ میں نمودار ہوگی کیوں کہ زمانہ کے بدلنے کے ساتھ آرزو اور تصورات کے عشق کے بجائے مصلحتیں یا زیادہ سے زیادہ نجی و ذاتی تجربات ہی ہمارے ادب کا معیار ہیں۔

مجازؔ کے جاننے والے ایسے جاننے والے جوان کے ہم عہد تھے ابھی بہت سے ہمارے بیچ میں ہیں لیکن ان میں سے کسی نے مجازؔ اور اس کے عہد کی اہمیت نئی نسل کے سامنے پیش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ ان کے اس اسرار اور خاموشی اور نئی نسل کے ادیب کی تنہائی نے وہ شمع بالکل ہی بجھادی ہے جس کو مجازؔ اور ان کے ساتھیوں نے روشن کیا تھا۔

مجازؔ کے بارے میں ایک عام خیال جو پرانی پیڑھی سے نئی پیڑھی سے پہونچا ہے وہ یہ ہے کہ وہ دوست بہت اچھے تھے اور لطیفے کہتے اور بذلہ سنجی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ لیکن کیا مجازؔ کی شخصیت اتنی سطحی ہے کہ ان کی دوستانہ رواداری اور لطیفہ گوئی ہی ان کو سمجھنے کے لئے کافی ہے؟ یقیناً نہ ہوگی کیوں کہ آزادی کی جد وجہد کے دوران اگر کوئی پرخلوص شاعر اس سچ دھج سے سامنے آتا ہے جس سج دھج سے مجازؔ سامنے آئے تھے تو وہ اتنی سطحی شخصیت کا مالک نہیں ہو سکتا۔

ادھر کچھ دنوں سے لکھنؤ میں پھر ایک مرتبہ ادبی دھیں جنون کے آثار پیدا ہو چلے ہیں جو ابھی اپنی بہت ابتدائی شکل میں ہیں۔ کچھ کام شروع ہوا کچھ "باغیانہ" باتیں بھی سننے میں آجاتی ہیں۔ یہ جنون اگر ۱۹۴۷ء کے قبل کے جنون سے اپنی شمع روشن کرے تو یہ ایک مبارک بات ہوگی۔ اگر مجازؔ کی یاد منانے سے دلوں میں پھر آرزوئیں بیدار ہونے کے آثار پیدا ہوں

(بقیہ صفحہ ۶۷ پر)

مجاز کی یاد

منظر سلیم

مجاز کی یاد سے لکھنؤ کی ایسی ادبی سرگرمیوں کی یادیں بھی وابستہ ہیں جو اب شاید ہی کبھی دیکھنے میں آئیں۔ ۱۹۴۷ء سے قبل اور بعد کے چند برسوں میں یہاں جس پیمانے پر جدید ادبی تحریک کو فروغ حاصل ہوا اور جیسے اچھے ادب کی بڑے پیمانے پر تخلیق ہوئی اس کی شاید ہی اردو کے کسی دوسرے ادبی مرکز پر مل سکے۔ کوئی معیاری رسالہ یا انتخاب ایسا نہ ہوتا تھا جس میں اس وقت کے لکھنؤ کے متعدد لکھنے والوں کی تخلیقات نہ شامل ہوتی ہوں۔ ناقدوں میں ڈاکٹر عبدالعلیم، آل احمد سرور اور سید احتشام حسین پیش پیش تھے۔ علیم صاحب ہمیشہ کی طرح اس زمانہ میں بھی بہت کم لکھتے تھے لیکن ادبی جلسوں میں تنقیدی مضامین، افسانوں اور نظموں پر ان کی جچی تلی رائے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ اس کے برخلاف آل احمد سرور اور سید احتشام حسین کی تخلیقی سرگرمیاں پورے شباب پر تھیں اور ایک لحاظ سے ان دونوں ناقدین کی شہرت اور مقبولیت میں اس دور کے لکھے ہوئے مضامین کا بہت ہاتھ ہے۔ انھیں دنوں اردو تنقید ایک نئے نام سے متعارف ہو رہی تھی۔ یہ تھے ڈاکٹر محمد حسن، انھوں نے اس وقت تک بہت کم مضامین لکھے تھے لیکن جس محنت اور لگن کے ساتھ وہ ادب کے مطالعہ اور اچھے ادب کی تخلیق کی تیاریوں میں مصروف تھے وہ آگے چل کر ان کے اور اردو ادب دونوں کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔

افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری سارے ہنگاموں سے الگ تھلگ "شکستہ کنگورے" کے افسانے لکھنے میں مصروف تھے۔ قرۃ العین حیدر کے افسانے اردو رسائل میں

شائع ہونے لگے تھے اور انھوں نے اپنی گنتی کے افسانوں اور مخصوص انداز تحریر سے ادبی دنیا میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ یہی حال شوکت صدیقی کا بھی تھا۔ انھوں نے اس وقت تک زیادہ افسانے نہیں لکھے تھے لیکن وہ بھی ڈاکٹر محمد حسن کی طرح خود کو آنے والے دنوں کی تخلیقی ذمہ داریوں کے لیے بڑی محنت کے ساتھ تیار کر رہے تھے۔ وہ کوئی افسانہ لکھنے سے دو تین ماہ قبل اس کے بارے میں دوستوں سے تبادلہ خیال شروع کر دیتے تھے اور جب ایک ایک تفصیل ان کے ذہن میں واضح ہو جاتی تھی تو یقیناً جیسا افسانہ لکھ دیتے تھے۔

شاعروں میں پنڈت آنند نرائن مُلا، سراج لکھنوی اور اثر لکھنوی جدید ادبی تحریکوں کے زیر اثر غزل کو نیا ساز و آہنگ دینے میں مصروف تھے۔ خود مجاز بھی کبھی کبھار کوئی نظم یا غزل اس معرکے کا لکھتے تھے کہ مہینوں اس کا چرچا رہتا تھا۔ سلام مچھلی شہری کا یہ حال تھا کہ غالباً ہر روز ایک نظم لکھتے تھے اور جدید نظم کے نئے شاعروں میں راقم الحروف اور کمال احمد صدیقی کی نظمیں دہلی اور لاہور کے پرچوں اور سال کے سال شائع ہونے والے منتخب نظموں کے مجموعوں میں شامل ہونے لگی تھیں۔ اسی طرح اور بھی متعدد لوگ تھے جو ریڈیو ڈرامے، افسانے اور نظمیں لکھ رہے تھے۔ ان سب کی وجہ سے حضرت گنج کا پرانا کافی ہاؤس ایک طرح کا ادبی مرکز بن گیا تھا۔ شام کو ڈاکٹر علیم کی میز کے گرد لوگ اکٹھا ہونا شروع ہوتے تھے۔ دو کرسیوں سے چار، چار سے چھ اور بعض اوقات آٹھ دس کرسیاں تک ایک چھوٹی سی میز کے گرد اکٹھا ہو جائیں اور ۹ بجے رات تک سخت مباحثہ، شعر و شاعری اور ہنسی مذاق کا سلسلہ جاری رہتا۔ پھر حضرت گنج سے علیم صاحب اور سرور صاحب کے اپنے گھروں کو واپس لوٹ جانے کے بعد ادیبوں شاعروں کا قافلہ امین آباد کی طرف روانہ ہوتا اور یہاں رات گئے تک چائے خانوں میں محفلیں جمتیں اور نظموں اور افسانوں کے خاکے مرتب ہوتے۔

ہر ہفتہ ہونے والے جلسوں میں جو زیادہ تر آل احمد سرور کے چھوٹے سے خوبصورت مکان میں ہوتے تھے اردو کے اتنے مشہور لکھنے والے اکٹھا ہو جاتے تھے کہ چھوٹی موٹی کانفرنس

کا گمان گزرتا تھا۔ ان میں ڈاکٹر علیم، آل احمد سرور، سید احتشام حسین، حیات اللہ انصاری، ڈاکٹر رشید جہاں، آنند نرائن مُلا، اثر لکھنوی، رضیہ سجاد ظہیر، اسرار الحق مجاز، شوکت صدیقی، ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر احسن فاروقی، سلام مچھلی شہری، کمین احسن کلیم، مسیح الحسن، کمال احمد صدیقی اور متعدد دوسرے لکھنے والے سبھی شامل ہوتے تھے۔ اور بحث کچھ اس انداز کی ہوتی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ لاٹھی ڈنڈے کی نوبت آجائے گی۔

مجاز ان سب ادیبوں شاعروں میں بہت مقبول تھے۔ سب لوگ ان سے بیحد محبت کرتے تھے اور غالباً ایک انھیں کی ذات ایسی تھی جس پر نکتہ چینی نہیں ہوتی تھی جن کا کوئی مخالف نہیں تھا جن سے کسی کو کوئی شکایت نہیں پیدا ہوئی تھی یہاں تک کہ کبھی کبھار وہ نشے کی حالت میں اگر کافی ہاؤس میں ادیبوں شاعروں کے پاس بیٹھ جاتے تھے۔ تب بھی کوئی ناخوشگوار صورت حال پیدا نہ ہوتی۔

اس پورے گروہ میں علیم صاحب کو چھوڑ کر مجاز ہی ایک ایسے تھے جن کے لکھنے کی رفتار غالباً سب سے دھیمی تھی اور سال میں ایک دو نظم غزل کا اوسط پڑتا تھا۔ وہ اس دور میں قدم رکھ رہے تھے جس میں شراب ان کے لئے ہر شے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی اور شراب حاصل کرنے کے لئے ظاہر ہے کہ انھیں خاصی جد وجہد کرنی پڑتی تھی۔ کیونکہ مشاعرے یا ریڈیو پروگرام کے سوا ان کی آمدنی کا دوسرا ذریعہ نہ تھا اس تمام بھاگ دوڑ کے نتیجہ میں انھیں بڑی حد تک ذہنی الجھنوں کا بھی شکار ہونا پڑتا تھا۔ چنانچہ اس وقت ان کے سامنے دو مسائل تھے ایک تو یہ کہ ان کے دوست احباب ان کے ارد گرد کا سارا ماحول ادبی لحاظ سے تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف تھا۔ لوگوں کی نظمیں، افسانے اور مضامین بڑے آب و تاب سے رسالوں میں شائع ہو کر آتے تھے، سالناموں میں لکھنؤ کے ادیبوں شاعروں کی تصویریں شائع ہوتی تھیں۔ اور لوگ یہ سارے رسالے لے کر کافی ہاؤس آتے اور ایک دوسرے کو دکھاتے تھے چنانچہ ایک طرح سے مقابلے کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن مجاز کا حال اس سے بالکل مختلف تھا۔ وہ بہت کم لکھتے تھے

اس لئے ان کی نظموں غزلوں یا تصویر سے اتنی پابندی کے ساتھ رسائل میں شائع ہونے کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ چنانچہ ایک طرف تو ایک حساس شاعر کا یہ احساس تھا وہ تخلیقی اعتبار سے اپنے ہم عصروں کی جیسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے پا رہا ہے۔ اور وہ جیسا اور جتنا لکھ رہا ہے اسے اس سے زیادہ اچھا لکھنا چاہیئے (اور بعض اوقات وہ اپنی اس الجھن کا اظہار بھی کرتے تھے) دوسری طرف زندگی کی مادی الجھنیں اور دشواریاں تھیں۔ یہ الجھنیں کھانے کپڑے کی حد تک نہ سہی لیکن شراب کی ضرورت کے سلسلے میں بہر حال تھیں۔ ان حالات میں ان کے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو جاتا تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی لیکن اس سارے گروہ میں وہ جیسے اعلیٰ ظرف کے مالک تھے اس کو یاد کرکے آج حیرت ہوتی ہے۔ ادیبوں شاعروں میں ایک طرح کی منافقت کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ لوگ آپس کی ساری دوستی کے باوجود ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے جوڑ توڑ بھی کرتے تھے ایک دوسرے سے جلتے تھے ایک دوسرے کے اچھے افسانے اور اچھی نظم میں بھی جان بوجھ کر برائیاں تلاش کرتے تھے لیکن مجاز کا حال بالکل مختلف تھا۔ وہ نہ کسی کی ترقی کو دیکھ کر جلتے تھے نہ کسی کے خلاف کوئی جوڑ توڑ کرتے تھے۔ تمام لوگوں کو اپنا دوست تصور کرتے تھے ان کی چیزیں بڑی توجہ سے سنتے اور تعریف کرتے تھے۔ ادبی معاملات، ادبی جلسوں اور کانفرنسوں اور اس وقت کی اس سیاست کے سلسلے میں جو ادب پر حاوی تھی وہ بڑے سنجیدہ تھے اپنی تمام ذہنی الجھنوں کے باوجود وہ ادبی جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور آخر تک موجود رہتے۔ بحث کرنے کی ان کی عادت نہ تھی اور بہت کم بحث میں حصہ لیتے لیکن جلسوں میں جو طویل بحثیں چھڑ جاتی تھیں۔ ان سے انھیں کوفت بھی نہیں ہوتی تھی اور بعض اوقات

تو گھنٹوں کی لاحاصل بحث پر کوئی ایسا فقرہ چست کر دیتے تھے کہ لوگ تڑپ کر رہ جاتے۔

مجاز اپنی نسل سے پہلے کے ادیبوں شاعروں کا بے حد احترام کرتے تھے کبھی جگر صاحب آکر بھوپال ہاؤس میں مقیم ہوتے تو وہ پابندی کے ساتھ ان سے جس طرح ملنے جاتے اور جس عقیدت سے ان کے پاس بیٹھے رہتے وہ بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی طرح وہ سرور صاحب، احتشام صاحب اور ملا صاحب وغیرہ کا احترام کرتے تھے۔ ان کا یہ رویہ اسی دور میں خاص طور سے اہمیت رکھتا تھا کیونکہ وہ ادب پر کمیونسٹ انتہاپندی کے غلبہ کا زمانہ تھا۔ بات بات پر رجعت پسندی کا طعنہ دیا جاتا تھا اور ادبی جلسوں میں یونیورسٹی کے لڑکے اور کمیونسٹ پارٹی کے معمولی کارکن ان مشہور ادیبوں شاعروں سے یوں الجھ جاتے تھے جیسے کہ وہ اپنی عمر کے کسی بے تکلف دوست یا حریف سے جھگڑا کر رہے ہوں۔ اس دور میں ملا صاحب، یا سرور صاحب یا ڈاکٹر علیم کے کافی ہاؤس میں داخل ہونے پر مجاز کا خواہ وہ اپنے مداحین کے جھرمٹ میں گھرے ہی کیوں نہ ہوں کھڑا ہو جانا بڑی غیر معمولی بات تھی۔

جہاں تک اس زمانے کی نئی نسل کے لکھنے والوں کا تعلق تھا ان کا مجاز سے بڑھ کر کوئی اور ہمدرد اور دوست نہ تھا۔ وہ ان کی ادبی سرگرمیوں کے متعلق پوچھتے رہتے۔ ان کی چیزیں سنتے اور تعریف کر کے ان کا حوصلہ بڑھاتے جو ان سے مشورہ کرتا اسے مشورہ دیتے۔ جو ان سے قریب آتا اسے اور زیادہ قریب آنے کا موقع دیتے اپنے ساتھ مشاعرے میں لے جاتے کبھی کسی سے تعارف کراتے تو تعریفی کلمات استعمال کرنا نہ بھولتے اور کبھی انھیں کہیں سے روپئے ملتے تو اس بات کی کوشش کرتے کہ ان کے ہم عصر دوستوں کے ساتھ ہی ساتھ نئی نسل کے وہ چند لکھنے والے بھی جو ان سے زیادہ قریب تھے اس روپئے سے حاصل

ہونے والی تفریح میں شریک ہوں۔ انتہا یہ تھی کہ شراب کی میز پر بھی وہ اس سلسلے میں غافل نہیں ہوتے تھے۔ ان دنوں بعض لوگوں کا یہ محبوب مشغلہ تھا کہ جن لکھنے والوں کو کافی ہاؤس کی میز پر اپنے طنز کا نشانہ نہیں بنا پاتے تھے ان سے شراب کی میز پر نشے کی آڑ میں نبٹ لیں۔ لیکن مجازؔ ایسے موقعوں پر بھی جب انھیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں ہوتا تھا جانے کس طرح اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ ان کے رویہ سے کسی کا دل نہ دکھے۔ دل دکھانا تو شاید انھیں آتا ہی نہ تھا۔

پھر آزادی کے بعد کے برسوں میں جیسے جیسے زمانہ بدلا لکھنؤ کے ادیبوں شاعروں کی یہ محفل درہم برہم ہوتی گئی، کچھ لوگ پاکستان سدھارے کچھ اپنی ملازمتوں کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر کے ہو رہے۔ اور کچھ جو باقی بچے وہ اس غم کا شکار ہو کر رہ گئے کہ اب کسی کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں کافی ہاؤس جائیں تو جانا پہچانا چہرہ کہاں نظر آئے۔ جلسہ ہو تو کہاں اور بحث کرے تو کون۔ کچھ برسوں تک یہ عبوری دور چلتا رہا۔ اس عرصہ میں مجازؔ میں بھی تبدیلیاں پیدا ہوئیں ان کی پریشانیوں اور الجھنوں میں اضافہ ہوا۔ انھیں تنہائی کا احساس ستانے لگا اور شاید انھیں باتوں کا نتیجہ تھا کہ شراب سے ان کا یارانہ بڑھ گیا۔ پھر اپنوں سے بچھڑنے کے بعد انھیں نے جن غیروں سے رشتہ جوڑنا پڑا وہ شعر کہنے والے مجازؔ سے زیادہ شراب پینے والے مجازؔ کے دوست ثابت ہوئے۔ آخر کار اس یادگار دور کا یہ ممتاز رکن اس شہر اور اس کے ادبی ہنگاموں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔

اب لکھنؤ میں اردو ادیبوں شاعروں کی سرگرمیاں پھر بڑے پیمانے پر شروع ہوئی ہیں اور ایک نیا گروہ ابھر کر سامنے آرہا ہے تو شاید اس شہر کی گزشتہ ادبی روایات سے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑنے کے لئے ہم مجازؔ کو یاد کر رہے ہیں یہ دراصل مجازؔ ہی یاد نہیں ہے بلکہ ایک بیتے ہوئے اہم ادبی دور کی یاد بھی ہے جس کا ایک بار پھر لکھنؤ کو انتظار ہے۔

مجاز ایک رومانی شاعر

حسرت ملیح آبادی

جہاں تک مجاز مرحوم کے نغموں کی لطافت کا تعلق ہے وہاں تک انھیں ایک بلند ترین رومانی شاعر کہنے میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی غنائی شاعری کا بہاؤ ہمیں اس طرح بہائے جاتا ہے کہ ہم کھوسے جاتے ہیں ڈوب سے جاتے ہیں، ان کا یہی وہ جادو ہے جو ابتدا سے سر چڑھ کر بولا اور انھیں مقبول اور ہر دلعزیز شاعر ثابت کرنے میں سو فی صدی کامیاب رہا۔

انھوں نے شعر و ادب کی دنیا میں اس وقت قدم رکھا جب قدیم صالح قدریں جدید صحت مند قدروں سے ہم آہنگ ہو رہی تھیں۔ انفرادیت کا دور بڑی حد تک ختم ہو چکا تھا اور معاشرہ میں سیاسی و سماجی شعور پھیلتا جا رہا تھا، اس لیے ان کی شاعری میں میر کا سوز بھی ہے اور نئے دور کی جھلک بھی۔ مجاز نے نارم (NORM) کے اعتبار سے کسی جدت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ اسی ڈگر پر چلے جو ان سے پہلے کے شعراء نے اپنے لیے مخصوص کر لی تھی۔ لیکن میٹر (MATTER) کے اعتبار سے انھوں نے ضرور عصری تقاضوں کا ایک حد تک احترام کیا۔ مثال کے طور پر :

تیرے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

مگر اس آواز کو انقلاب کا اعلان سمجھ کر انھیں باغی شاعر کہنا کچھ اچھا نہیں

معلوم ہوتا۔ یوں تو بغاوت انسانی فطرت میں داخل ہے اور ادیب اور شاعر جو سوسائٹی کے افراد ہونے کے باوجود عام آدمیوں سے زیادہ حساس اور بالغ نظر ہوتے ہیں۔ ہر دور میں کسی نہ کسی حد تک فرسودہ روایات سے بغاوت کرتے آئے ہیں اور زندگی کے قافلہ کو ارتقائی مدارج طے کرنے میں سہارا دینے کے لیے ہمیشہ دل و جان سے حاضر رہے ہیں۔

مجاز بھی یقیناً وجدانی شاعر تھے اُن کے احساسات بھی لطیف تھے علوم و فنون پر نظر رکھتے تھے۔ اشتراکی فلسفہ کو سمجھتے تھے۔ اور ایسے ترانے بھی الاپتے تھے جو بغاوت سے بھرپور تھے اور ہیں۔ لیکن حقیقتاً وہ انقلابی یا سیاسی شاعر نہ تھے ـــــ کچھ لوگ ان کا مرتبہ بلند کرنے کے لیے انھیں اس قسم کا شاعر گردانتے ہیں اور ان کی زندگی کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ ایک نقّاد کا یہ شیوہ نہ ہونا چاہیے کہ وہ کھینچ تان کر اپنے معیار پر کسی فنکار کو لے آئے بلکہ اس کا صحیح کام یہ ہے کہ جس صاحب قلم کا وہ جائزہ لے رہا ہے اس کی شرح کی گہرائیوں تک پہونچنے کی کوشش کرے ـــــ بلاوجہ ترقی پسند کہہ دینا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

ویسے تو ترقی پسند کا ٹکڑا معنوی اعتبار سے بہت وسیع ہے جس نے بھی اپنے عہد میں بکھرے ہوئے جال کو کاٹ کر آگے قدم بڑھانا چاہا وہ ترقی پسند ہو گیا اور اور اسی لیے کہا جاتا ہے کہ غالب بڑے ترقی پسند شاعر ہیں۔ لیکن آج جو ترقی پسندی کا مفہوم ہمارے ذہنوں میں ہے وہ فلسفہ واشتراکیت کا ایک واضح عکس ہے۔ یہ دوسری بات ہو کہ ہم کسی مصلحت کی بنا پر اس کا اظہار نہ کریں۔ اور اپنی ترقی پسندی کو کسی سیاسی رجحان سے ملوث نہ ظاہر کرنے کی خاطر دامن بچائیں

اور مختلف انداز سے تشریح کریں مگر یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ
زاریت کے خاتمہ پر جو سرخ سویرا نمودار ہوا اس کی تابانیاں دور
دور تک پھیلیں اور زندگی کو نئی روشنی عطا کرنے کا سبب بنیں۔ اور خصوصیت
کے ساتھ نوجوان طبقہ اس سے متاثر ہوا اور حقیقت نگاری کے میدان میں
کود پڑا۔ مجاز بھی جوان تھے، تعلیم یافتہ تھے، ملک و قوم سے محبت کرتے تھے
پھر کیوں نہ اس سے متاثر ہوتے ان کو یہ راہ بھلی معلوم ہوتی تھی۔ اور ہر
دکھ کی بے نظیر دوا محسوس ہوتی تھی اور چاہتے تھے کہ اس کا استعمال جاری
ہو جائے۔ لیکن معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ محض جذباتی انداز میں۔
اس دعویٰ کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے آپ کو ان کی زندگی کا جائزہ لینا
پڑے گا۔ وہ ایک کھاتے پیتے خوش حال گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ لاڈلے
بیٹے ہونے کے باعث ابتدا سے من مانی کرنے کے عادی رہے۔ جب بچپن شباب سے
ہمکنار ہوا تو منچلی نگاہیں گردش کرنے لگیں۔ ممکن تھا ابتدا ہی کسی کے دامن
شوق سے باندھ دیئے جاتے تو تشنگی بڑھنے نہ پاتی مگر باپ نے نفسیاتی تکنیک سے
بیٹے کو دیکھا نہیں اور شادی بیاہ کا مسئلہ اپنے قدموں پر کھڑے ہونے کے انتظار
میں بالائے طاق رکھ دیا۔ مانگ پوری نہ ہوئی۔ جبلی بہاؤ نے قوت تخلیق کو
متحرک کیا اور شاعر بن کر حریم ناز تک پہنچنے لگے۔ خیر مقدم بڑا شاندار ہوا
امیدیں بندھیں توقعات قائم کی گئیں۔ اور جب پورے یقین و اعتماد کے ساتھ
وہ کسی کو اپنانے کے لیے آگے بڑھے تو پرویز شاہدی کی زبان میں جواب ملا ؎

کیوں حسن ہو مرعوب مرا ان کی نظر سے
ایک اچھے سے شاعر ہیں وہ افسر تو نہیں ہیں

کیا لائے ہو دینے مجھے پرویز کے تحفے
اشعار ہی اشعار ہیں زیور تو نہیں ہیں

اگر ساغر نظامی کی طرح ہوش گوش سے کام لیتے تو ممکن تھا چونک کر نئے انداز پر سوچنے سمجھنے کی کوشش کرتے۔ لیکن بڑے گھر کے پروردہ تھے اور اس کی جلیلہ روایات کے ساتھ جذباتیت کے لاشعوری طور پر بھی اسیر تھے لہذا اپنی انا کا فی پیہم کو سماجی پیچ و خم کے آئینہ میں دیکھنے لگے اور جھلا کر کہہ اٹھے ؎

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و سامان پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستان پھونک دوں
تخت سلطاں کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں

یہ لب و لہجہ اصولی طور پر ہم جوانوں کو بھلا معلوم ہونا چاہیئے تھا۔ ہم جھوم اٹھے اور مجاز مرحوم کو واہ واہ کے ہنگامہ میں کبھی یہ محسوس کرنے کا موقع نہ مل سکا کہ صحیح ترقی پسندی فرد کی پامالی پر مشتعل نہیں ہوتی۔ فرد کی تو اس کے یہاں کوئی حیثیت ہی نہیں ہے چنانچہ پرویز شاہدی کہتے ہیں ؎

دل میں میرے خیال ہے اپنا نہ آپ کا
میخانہ بنتا جاتا ہے پیمانہ آپ کا

ترقی پسندی انفرادیت کی شکار نہیں ہوتی وہ ایک اجتماعی جذبے کی پیداوار ہے اسے فرد کی ناکامی متاثر نہیں کرتی اسے تو یہ معلوم ہی ہوتا ہے کہ جب تک تبدیلیاں نہ ہوں گی اس وقت تک ایسی ناکامیابی یقینی حصہ میں آتی رہیں گی۔ ان سے مشتعل ہو کر کس کے گلشن یا شبستان کو پھونک دینے سے حاصل کیا ہو گا۔ بات تو جب بن سکتی ہے کہ نئی دنیا کی تعمیر ہو۔ اور جذبۂ تعمیر اسے تخریب کی طرف

مائل ہی نہیں کر سکتا وہ سینے پر بے شمار گھاؤ کھانے کے بعد بھی مسکراتا ہوا آگے بڑھتا جاتا ہے اور اپنے عمل سے ایسی مثال قائم کرتا ہے کہ دیکھنے والوں میں ساتھ چلنے کا حوصلہ پیدا ہو۔ مثال کے طور پر ساحر لدھیانوی کا یہ ایک شعر لیجئے ؎

کس طرح تم کو بنا لوں میں شریک زندگی

میں تو اپنی زندگی کا بار اٹھا سکتا نہیں

انصاف سے بتائیے جذبات پر کتنا زبردست قابو ہے، دوسرے کی زندگی کا کتنا احترام ہے اور دل کی باگ ڈور کس شدت سے دماغ کے ہاتھ میں ہے۔ ترقی پسند تو ایک نمونہ ہوتا ہے۔ ترقی پسندی نام ہے ایک ایسے رجحان کا جو صحت مند سماج کی طرف سے لے جاتا ہو۔ جس میں اپنے نفس کو مارنے کا سبق عام ہو۔ اور انسان کے لیے جو فرسودہ باتیں غیر مناسب معلوم ہوں ان کے خلاف لعن طعن کی بے پرواہ ہو کر علم بغاوت بلند کر سکے اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ ترقی پسند حقیقت نگار ہوتا ہے۔ اس سے یہ برداشت نہیں ہوتا کہ رستے ہوئے ناسور پر پردہ ڈال دے اور بیمار کو صرف اس غرض سے بیمار نہ کہے کہ تہذیب کے خلاف ہے۔ وہ تھا ایک کامیاب جراح ہے بیدھڑک نشتر لگاتا ہے۔ گندے مواد کی اگر تعفن پھیلتی ہے تو یہ اس کی خطا نہیں ہوتی بلکہ اس متعفن مواد کا قصور ہوتا ہے جو صدیوں سے زخموں میں گھٹ گھٹ کر سڑتا جا رہا تھا۔ اس کی انسانی دوستی اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ گندی چیز کو بجائے بند رکھنے کے نکال باہر کردے اس عمل کے نتیجہ میں خود اسے خارش زدہ کتا سمجھ لینا انھیں حضرات کا کام ہو سکتا ہے جو ظاہر سے ہٹ کر باطن کا جائزہ نہیں لے سکتے۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ڈاکٹر جو دوسروں کا علاج ضروری سمجھتا ہے وہ خود بیمار رہنا گوارا کرے گا۔ ایسے تو اگر ذرا سی

چھینک بھی آئے گی تو نہ جانے کیسی کیسی دوائیں کر ڈالے گا۔ چوں کہ وہ عام آدمیوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اس حقیقت سے واقف ہوتا ہے کہ ایک حقیر سی چھینک بھی کسی بڑے مرض کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لیے فرار و گریز کی اس کے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی خود فراموشی گوارا نہیں کر سکتا۔ بقول ساحر لدھیانوی ؎

گر جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں مفلسوں کو بیکسوں کو بے سہاروں کو
سسکتی نازنینوں کو تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدد کو امارت کے تکبر کو
کسی کے چیتھڑوں کو اور شہنشاہی خزانوں کو

تو دل تاب نشاط بزم عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو کیف آور ترانے گا نہیں سکتا

کسی صحت مند تحریک کو دل و دماغ میں رچا بسا لینے کے بعد ممکن ہی نہیں ہے کہ گرد و پیش سے چشم پوشی کی جائے۔ جو حضرات مجاز مرحوم کو ترقی پسند قرار دیتے ہیں انھیں سب سے پہلے ترقی پسندی کو سمجھنا چاہیے اور مجاز کی شاعری پر غیر جانبدار ہو کر نظر ڈالنی چاہیے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ ترقی پسند ہونا نہ کوئی بلندی کی دلیل ہے نہ کسی پستی کی علامت۔ یہ تو ایک اسکول آف تھاٹ ہے اس سے متاثر ہو کر بھی عظیم فنکار بنا جا سکتا ہے اور نا وابستگی کے بعد بھی فنکارانہ صلاحیتیں بام عروج پر پہونچ سکتی ہیں۔ میر ہی کو لے لیجیے ان کے بہتر شعر ہمیشہ دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتے رہیں گے اور پھر اقبال کے کلام

کو سامنے رکھیے جو باوجود اپنے عمق اور گہرائی کے اکثر غیر جمالیاتی ہونے کے باعث دماغ کو تو ممکن ہے سوچنے کی دعوت دیتا ہو دل کے تاروں کو مرتعش نہیں کرتا۔

مجاز رومانی شاعر تھے۔ اسی لیے نوجوانوں کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی باتیں اپنی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اور ان کی شاعری شباب و مستی کی علامت ہے۔ ان کے اندر ایک حساس نوجوان چھپا ہوا تھا جو معاملات شوق میں ناکام ہونے پر جذباتی انداز میں ایسے ترانے الاپنے لگتا ہو جو بغاوت سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں اپنے دور میں بھی نوجوان گھیرے رہتے اور مرنے کے بعد بھی خراج عقیدت پیش کرنے میں سب سے آگے ہیں۔ یہ مجاز کی شاعری کی صداقت اور کشش کا نتیجہ ہے۔ وہ وجدانی فنکار تھے انھوں نے جو محسوس کیا وہی کہا اور ہمیں کسی کے احساسات کے بارے میں یہ کہنے کا حق نہیں کہ وہ ایسے کیوں تھے؟ ویسے کیوں نہ ہوئے؟ ہمیں تو بس یہ دیکھنا ہے کہ جس کے جو احساسات تھے وہ فن کے سانچے میں کسی انداز سے چھلکے ہیں اگر فنی حیثیت ان کی مکمل ہے تو یقینی ان کی بڑائی کا قائل ہونا پڑے گا۔ اور مجاز کی فنی کی حیثیت مسلم ہے۔ انھوں نے قواعد و ضوابط کا قدم قدم پر احترام کیا ہے اور بہت ہی کم لغزشیں کی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں ایک عظیم اور بڑے شاعر بننے کی ساری قوتیں موجود تھیں اور بقول جعفر علیخاں اثر "اگر بھیڑیئے نہ اٹھالے جاتے تو شاید ایک نیا میرؔ ہماری اردو شاعری میں نمودار ہو کر رہتا۔"

مجاز کی شاعری سوز و ساز کا مجموعہ ہے۔ محبت و پیار کی دنیا ہے۔ اور دل کی دھڑکنوں سے بھرپور ایک سریلی بانسری ہے ان کے کلام کے مجموعہ کا نام "آہنگ" بالکل صحیح ہے۔ حسن و عشق کی ہم آہنگی ان کا ایمان رہا جو لوگ انہیں محض انقلابی شاعری میں اسیر کرکے دیکھتے ہیں وہ ان کے رقص مستانہ کا لطفِ نظارا مجروح کر دیتے ہیں۔

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

یوم مجاز

اقبال عمر

اے صبا تو ہی بتا آج یہ عالم کیا ہے
"نشۂ مے بھی سنا آج خفا ہے مے سے"
خالی خالی ہیں سبو جام ہیں چھلکے چھلکے
سہمے سہمے در دیوار ہیں دیکھو کیسے
آج خاموش ہے میخانے کا میخانہ کیوں
بات سنتا ہی نہیں کچھ دل دیوانہ کیوں

دل ہے ویران تو آنکھوں میں نہیں بینائی
آنسوؤں میں نظر آتی ہے خالی کائی
اڑ گئی جیسے گلستاں کی ہر اک زیبائی
جیسے باقی نہ رہی پھولوں میں وہ رعنائی
اب کوئی شہر نگاراں میں وفادار نہیں
اب کوئی ناز اٹھانے پہ بھی تیار نہیں

نکہت شعر سے مہکے ہوئے رخسار کہاں
نشۂ فکر سے بہکی ہوئی رفتار کہاں
لے کا وہ رقص وہ پازیب کی جھنکار کہاں
محفل حسن کہاں شاعر بیدار کہاں
یاد رکھیے گا کہ ہم یاد کریں گے برسوں
رہ کے خاموش بھی فریاد کریں گے برسوں

شہرِ نگاراں

تضمین ـــ بہ ـــ اشعارِ مجاز

عفت بانو زیبا کاکوروی

میری ویران نگاہوں میں خمار آہی گیا
میری مایوس امیدوں پہ نکھار آہی گیا
اب مری آبلہ پائی کو قرار آہی گیا
"رخصت اے ہمسفرو شہرِ نگار آہی گیا
خلد بھی جس پہ ہو قرباں وہ دیار آہی گیا"

دل پُر شوق کے تابندہ خیالوں کا جہاں
نگہ ناز کے رخشندہ جمالوں کا جہاں
حسن اور عشق کے جاں سوز کمالوں کا جہاں
"وہ جنوں زار مرا میرے خیالوں کا جہاں
میرا نجد آہی گیا میرا تتار آہی گیا"

اپنے ہی عارض و گیسو کے پرستاروں میں
حسن برہم کے دیکھتے ہوئے رخساروں میں
ناز والوں میں مئے حسن کے سرشاروں میں
"گیسوؤں والوں میں ابرو کے کماں داروں میں
ایک صیاد آہی گیا، ایک شکار آہی گیا"

خلد والوں کو سناؤ مہ و پروین سے کہو
نازنینانِ چمن، کاکلِ زرّیں سے کہو
حسن خود بیں سے کہو جلوۂ رنگیں سے کہو
"باغبانوں کو بلاؤ گل و نسرین سے کہو
اک خرابِ گلِ نسرین بہار آ ہی گیا"

لب رنگیں میں چھپائے مئے دوشیں کا اثر
ڈگمگاتے ہیں قدم نیند سے بوجھل ہے نظر
اس طرح جیسے نہیں ہے مرے آنے کی خبر
"خیر مقدم کو مرے کوئی بہ ہنگام سحر
اپنی آنکھوں میں لئے شب کا خمار آ ہی گیا"

ایک انداز ترنم لب شیریں پہ لیے
ایک طوفان بہاراں رخ رنگیں پہ لیے
تابشِ برق و شرر گیسوے مشکیں پہ لیے
"زلف کا ابر سیہ بازوے سیمیں پہ لیے
پھر کوئی زخمہ زنِ سازِ بہار آ ہی گیا"

جھک گئی شوق فراواں سے جواں سال نظر
شرم اور ناز سے بل کھا گئی نازک سی کمر
مل گئے حسن کی سرکار سے کچھ لعل و گہر
"ہو گئی تشنہ لبی آج رہینِ کوثر
میرے لب پر لب نعلین نگار آ ہی گیا"

ثنا خوانِ حسنِ نگاراں

ساحر لکھنوی

بہاروں میں وہ جاذبیت نہیں ہے، وہ رعنائی سنبلستاں نہیں ہے
ہے رنگینیٔ گلستاں سوئی سوئی، جو روحِ روانِ گلستاں نہیں ہے

نہ وہ ذکرِ صہبا، نہ وہ شورِ مستی، ہے چھائی ہوئی میکدے میں خموشی
وہ شیدائے حسنِ گلابی نہیں ہے، جگر تشنہ بادہ خواراں نہیں ہے

یونہی پھول تاراج ہوتے رہیں گے، یونہی اہلِ دل خون روتے رہیں گے
خزاں کا یونہی دور دورہ رہے گا، اگر فکرِ نظمِ گلستاں نہیں ہے

جہاں دیکھئے ڈیرہ ڈالے ہے ظلمت، جدھر دیکھئے تیرگی ہے مسلط
تھی دنیائے شعر و ادب جس سے روشن، افق پہ وہ مہرِ درخشاں نہیں ہے

بصد عشوہ و ناز و انداز و غمزہ، ہیں محفل میں ناہید و پروین و انجم
ہجومِ نگاراں تو اب بھی ہے ساحر، ثنا خوانِ حسنِ نگاراں نہیں ہے

۱۰ ۸۷

یادِ مجاز

نام اور کچھ بھی رہیں وہی ساغر اور پیمانے
لکھے جائیں گے اسی دل کے لہو سے اور افسانے

مجازؔ
کی
غزلیں
گیت
اور
نظمیں

مہمان

آج کی رات اور باقی ہے!

کل تو جانا ہی ہو سفر پہ مجھے
زندگی منتظر ہے منھ پھاڑے
زندگی خاک و خون میں لتھڑی
آنکھ میں شعلہ ہائے تند لیے
دو گھڑی خود کو شادماں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

چلنے ہی کو ہو ایک سموم ابھی
رقص فرما ہے روح بربادی
بربریت کے کاروانوں سے
زلزلے میں ہے سینۂ گیتی
ذوق پنہاں کو کامراں کر لیں
آج کی رات اور باقی ہے

ایک پیمانۂ مے پُرجوش
لطفِ گفتار گرمیِ آغوش
بوسے۔ کس درجہ آتشیں بوسے
پھونک ڈالیں جو میری کشتِ ہوش
روح بے خ لبتہ ہے نتپاں کرلیں
آج کی رات اور باقی ہے

ایک دو اور ساغرِ سرشار
پھر تو ہونا ہی ہے مجھے ہشیار
چھیڑنا ہی ہے سازِ زیست مجھے
آگ برسائیں گے لبِ گفتار
کچھ طبیعت تو ہم رواں کرلیں
آج کی رات اور باقی ہے!

پھر کہاں یہ حسیں سہانی رات
یہ فراغت یہ کیف کے لمحات
کچھ تو آسودگیٔ ذوقِ نہاں
کچھ تو تسکینِ سوزشِ جذبات
آج کی رات جاوداں کرلیں
آج کی رات اور آج کی رات

○

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارا پھروں
جگمگاتی، جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک دربدر مارا پھروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش یہ تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے دل کا حال
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ پھر وہ چھوٹی پھلجھڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی چوٹ سی دل پر پڑی
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشتِ دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی

میرے سینے پر مگر جلتی ہوئی شمشیر سہی
اے غمِ دل کیا کروں ، اے وحشتِ دل کیا کروں

راستے میں رک کے دم لے لوں میری عادت نہیں
لوٹ کر واپس چلا جاؤں میری فطرت نہیں
اور کوئی ہمنوا مل جائے یہ قسمت نہیں
اے غمِ دل کیا کروں ، اے وحشتِ دل کیا کروں

دل میں اک شعلہ بھڑک اٹھا ہے آخر کیا کروں
میرا پیمانہ چھلک اٹھا ہے آخر کیا کروں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

مفلسی اور یہ مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غمِ دل کیا کروں ، اے وحشت دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں کا خنجر توڑ دوں
تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں
کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں
اے غمِ دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

رات ہنس ہنسکر یہ کہتی ہے کہ میخانے میں چل
پھر کسی شہناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل
یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفان بلا میرے لیے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لئے
پر مصیبت ہے مرا عہد وفا میرے لیے
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

جی میں ٹھانی ہے کہ اب عہد وفا بھی توڑ دوں
ان کو پا سکتا ہوں میں یہ آسرا بھی توڑ دوں
ہاں مناسب ہے یہ زنجیر ہوا بھی توڑ دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

ہر طرف بکھری ہوئی رنگینیاں رعنائیاں
ہر قدم پر عشرتیں لیتی ہوئی انگڑائیاں
بڑھ رہی ہیں گود پھیلائے ہوئے رسوائیاں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و سامان توڑ دوں
اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں
تخت سلطان کیا میں سارا قصر سلطاں پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

نورا

(ایک نرس کی چارہ گری)

وہ نوخیز نورا وہ اک بنتِ مریم
وہ مخمور آنکھیں وہ گیسوئے پرخم

وہ ارضِ کلیسا کی اک ماہ پارا
وہ دیر و حرم کے لیئے اک شرارہ

وہ فردوسِ مریم کا اک غنچۂ تر
وہ تثلیث کی دخترِ نیک اختر

وہ اک نرس تھی چارہ گر جسکو کہیئے
مداوائے دردِ جگر جس کو کہیئے

جوانی سے طفلی گلے مِل رہی تھی
ہوا چل رہی تھی کلی کھل رہی تھی

وہ پُر رعب تیور وہ شاداب چہرہ
متاعِ جوانی پہ فطرت کا پہرہ

مری حکمرانی ہے اہلِ زمیں پر
یہ تحریر تھا صاف اس کی جبیں پر

سفید اور شفاف کپڑے پہن کر
مرے پاس آتی تھی ایک حور بن کر

وہ اک آسمانی فرشتہ تھی گویا
کہ انداز تھا اس میں جبرئیل کا سا

وہ اک مرمریں حورِ خلدِ بریں کی
وہ تعبیرِ آذر کے خوابِ حسین کی

وہ تسکینِ دل تھی سکونِ نظر تھی
نگارِ شفق تھی جمال سحر تھی

وہ شعلہ، وہ بجلی، وہ جلوہ وہ پرتو
سلیماں کی وہ اک کنیزِ سبکرو

کبھی اس کی شوخی میں سنجیدگی تھی
کبھی اس کی سنجیدگی میں بھی شوخی

گھڑی چپ گھڑی کرنے لگتی تھی باتیں
سرہانے مرے کاٹ دیتی تھی راتیں

عجب چیز تھی وہ عجب راز تھی وہ
کبھی سوز تھی وہ کبھی ساز تھی وہ

نقاہت کے عالم میں جب آنکھ اٹھتی
وہ اس وقت اک پیکر نور ہوتی
وہ انجیل پڑھ کر سناتی تھی مجھ کو
دوا اپنے ہاتھوں سے مجھ کو پلاتی
سرہانے مرے ایک دن سر جھکائے
خیالات پیہم میں کھوئی ہوئی سی
جھپکتی ہوئی بار بار اسکی پلکیں
وہ آنکھوں کے ساغر چھلکتے ہوئے سے
لبوں میں تھا لعل و گہر کا خزانہ
مہک گیسوؤں سے چلی آرہی تھی
مجھے لیٹے لیٹے شرارت کی سوجھی
ذرا بڑھ کے کچھ اور گردن جھکا لی
وہ شے جس کو اب کیا کہوں کیا سمجھئے
شراب محبت کا اک جام رنگین
میں سمجھا تھا شائد بگڑ جائے گی وہ
میں دیکھوں گا اس کے بپھرنے کا عالم
ادھر دل میں ایک شور محشر بپا تھا
ہنسی اور ہنسی اس طرح کھکھلا کر
نہیں جانتی ہے مرا نام تک وہ
یہ پیغام آتے ہی رہتے ہیں اکثر

نظر مجھ کو آتی محبت کی دیوی
تخیل کی پرواز سے دور ہوتی
ہنساتی تھی مجھ کو رلاتی تھی مجھ کو
"اب اچھے ہو" ہر روز مژدہ سناتی
وہ بیٹھی تھی تکئے پہ کہنی ٹکائے
نہ جاگی ہوئی سی نہ سوئی ہوئی سی
جبیں پر شکن بے قرار اسکی پلکیں
وہ عارض کے شعلے بھڑکتے ہوئے سے
نظر عارفانہ، ادا راہبانہ
مرے ہر نفس میں بسی جا رہی تھی
جو سوجھی بھی تو کس قیامت کی سوجھی
لب لعل افشاں سے ایک شے چرالی
بہشت جوانی کا تحفہ سمجھئے
سبو زار فطرت کا اک جام رنگین
ہواؤں سے لڑتی ہی لڑ جائیگی وہ
جوانی کا غصہ بکھرنے کا عالم
مگر اس طرف رنگ ہی دوسرا تھا
کہ شمع حیا رہ گئی جھلملا کر
مگر بھیج دیتی ہے پیغام تک وہ
کہ کس روز آؤگے بیمار ہو کر

پہلا گیت

(۱)

کون مرے سپنے میں آ کر رہ رہ کر مسکائے
امرت رس برسائے
من کی کلی کھل جائے
کون مرے سپنے میں آ کر رہ رہ کر مسکائے

کوئی یکایک سامنے آ کر نین سے نین ملائے
اور کبھی چھپ جائے
چھپ چھپ کر تڑپائے
کون مرے سپنے میں آ کر رہ رہ کر مسکائے

جیون کے آکاش پہ چمکے رہ رہ کر اک تارا
سندر روشن نیارا
من میں جوت جگائے
کون مرے سپنے میں آ کر رہ رہ کر مسکائے

شوخ، سجیلا، رسیا، چنچل چھیڑا کرے تڑپائے
میں روٹھوں وہ منائے
بہلائے، سمجھائے
کون مرے سپنے میں آ کر رہ رہ کر مسکائے

دوسرا گیت

آ رہی ہے نرالی بہار

جی میں جو کچھ ہے وہ کوئی کیسے کہے
میری رگ رگ میں نس نس میں ملہار ہے
بج رہے ہیں خوشی کے ستار —
آ رہی ہے نرالی بہار —

میری آشاؤں نے آج پہلے پہل
حسرتوں کا بنایا ہے رنگیں محل
کوئی کھولے ہے جس کے دوار —
آ رہی ہے نرالی بہار —

تارے ناچیں ہواؤں میں چھاگل بجے
میری دنیا سجے اور پل پل سجے
ہر طرف اک انوکھا نکھار —
آ رہی ہے نرالی بہار —

میری دنیا ہے کیا جگمگائی ہوئی
ہر طرف زندگی مسکرائی ہوئی
من ہے کیسی خوشی سے دوچار —
آ رہی ہے نرالی بہار —

غزلیں

تسکینِ دلِ محزوں نہ ہوئی وہ سعیٔ کرم فرما بھی گئے
اس سعیٔ کرم کو کیا کہیے بہلا بھی گئے تڑپا بھی گئے

ہم عرضِ وفا بھی کر نہ سکے کچھ کہہ نہ سکے کچھ سن نہ سکے
یاں ہم نے زباں ہی کھولی تھی واں آنکھ جھکی شرما بھی گئے

آشفتگیٔ وحشت کی قسم حیرت کی قسم حسرت کی قسم
اب آپ کہیں کچھ یا نہ کہیں ہم رازِ تبسّم پا بھی گئے

رودادِ غمِ الفت ان سے ہم کیا کہتے کیوں کر کہتے
اک حرف نہ نکلا ہونٹوں سے اور آنکھ میں آنسو آ بھی گئے

اربابِ جنوں پر فرقت میں اب کیا کہیے کیا کیا گذری
آئے تھے سوادِ الفت میں کچھ کھو بھی گئے کچھ پا بھی گئے

یہ رنگِ بہارِ عالم ہے کیوں فکر ہے تجھ کو اے ساقی
محفل تو تری سونی نہ ہوئی کچھ اٹھ بھی گئے کچھ آ بھی گئے

اس محفلِ کیف و مستی میں اس انجمنِ عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

(۲)

پرتوِ ساغرِ صہبا کیا تھا
رات اک حشر سا برپا کیا تھا

کیوں جوانی کی مجھے یاد آئی
میں نے اک خواب سا دیکھا کیا تھا

عشق نے آنکھ جھکا لی ورنہ
حسن اور حسن کا پردا کیا تھا

کیوں مجازؔ آپ نے ساغر توڑا
آج یہ شہر میں چرچا کیا تھا

شاعر شہر نگاراں

پیدائش
اکتوبر ۱۹۱۱ء

وفات
۱۹۵۵ء

اسرار الحق مجاز

گورنمنٹ سرکار پرنٹنگ پریس امین آباد پارک لکھنؤ